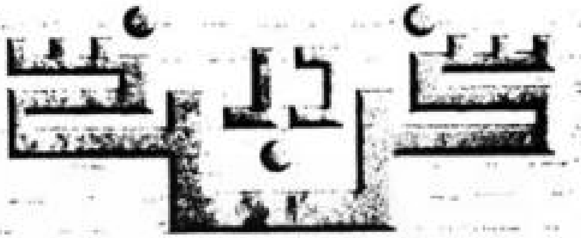

مُرتب: نقوش نقوی

محترمی جمال نقوی

کی نذر بصد احترام

محمد جمالی اردو بکری

۶ فروری ۲۰۰۹

maablib.org

سخن در سخن

"شائستہ سیاست و ادبی شخصیت" قمر جمالی امروہوی

کے شعری مجموعے

"صحرا میں شجر"

کے حوالے سے

معتبر و مستند دانشورانِ ادب

کے مضامین

اور منظوم اظہارِ عقیدت

مرتب

نقوش نقوی

زیرِ اہتمام

رائٹرز بک فاؤنڈیشن......ادارۂ سخنور پاکستان
نازش باغ B-6/C سادات امروہہ سوسائٹی، اسکیم 33 کراچی
Post Box No. 17830 Gulshan-e-Iqbal Karachi-75300

قمر جمالی امروہوی

maablib.org

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب:	سخن در سخن "شائستہ سیاست و ادبی شخصیت" قمر جمالی
مُرتب:	نقوش نقوی
سنِ اشاعت:	دو ہزار چھ
کمپوزنگ:	دانش، شبیہ "سخنور"
قیمت:	دو سو روپے
طابع:	ابنِ حسن پرنٹنگ پریس
ناشر:	رائٹرز بک فاؤنڈیشن پاکستان

ادارے کی شائع شدہ کتب رعایتی قیمت پر درج ذیل پتوں سے منگائی جا سکتی ہیں

Writer's Book Foundation "Sukhanwer"
Nazish Bagh B-6/C, Sadat-e-Amroha Society
Sector 37-A Scheme 33 Karachi -75280
Phone: 4901974 5890554

Dabistan-e-Mushafi
C-27, Mehmoodabad, 5.1-2, Karachi-75460

لوحِ جاں

۱......اولاً عرض	نقوش نقوی	ا
۱......قمر جمالی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	محسن ملیح آبادی	۰۷
۲......اوجِ قمر	پروفیسر سحر انصاری	۱۲۹
۳......قمر جمالی کی شاعری نئی نسل کے لیے چراغِ راہ	ڈاکٹر خیال امروہوی	۱۳۳
۴......شخصیت وفن	پروفیسر حسنین کاظمی	۱۳۶
۵......تہذیب وصداقت کا شاعر	بہار شاہجہانپوری	۱۴۱
۶......زیست شناس شاعر	سلطان الطاف علی	۱۵۰
۷......قمر جمالی کی شاعری میری نظر میں	روشن علی عشرت	۱۵۹
۸......قادر الکلام اور پُر گو شاعر	ڈاکٹر رضیہ حامد	۱۶۲
۹......صحرا میں شجر اور قمر جمالی	سید قمر رضی	۱۶۵
۱۰......دوستی کا سفر	ساقی امروہوی	۱۷۰
۱۱......ایک تاثر	پروفیسر اسحاق اطہر	۱۷۳
۱۲......صحرا میں شجر	پروفیسر قیصر نجفی	۱۷۵
۱۳......قمر جمالی	احمد حسین صدیقی	۱۷۸
۱۴......قمر جمالی دھیمے لہجے کا سبک شاعر	خمار فاروقی	۱۸۳
۱۵......شعور وآگہی کی مہک	ایس ایم معین قریشی	۱۹۰
۱۶......قمر جمالی شجر سایہ دار	اطہر شاہ خاں جیدی	۱۹۵
۱۷......صحرا میں شجر لگانے والا	جمال نقوی	۱۹۹

۱۸.....قمر جمالی روایتوں کا شاعر	مسرور جاوید	۲۰۳
۱۹.....قمر جمالی صحرا میں شجر اُگانا جانتے ہیں	جاوید منظر	۲۰۸
۲۰.....ایک ہمہ شخصیت	پروفیسر فاروق مغل	۲۱۰
۲۱.....قمر جمالی کا شعور شاعری	جمیل الدین فریدی	۲۱۲
۲۲.....روایت اور تہذیب کا شاعر	نگار فاروقی	۲۱۷
۲۳.....شبستانِ عشق کا شاعر	پروفیسر شبنم صدیقی	۲۱۳
۲۴.....صحرا میں شجر کا شاعر	شارق بلیاوی	۲۳۱
۲۵.....صحرا میں شجر ایک مطالعہ	نسیم انجم	۲۳۶

منظوم خراج عقیدت

۲۶.....نذرِ قمر جمالی	ڈاکٹر خیال امروہوی	۲۴۳
۲۷.....صحرا میں شجر	سہیل غازی پوری	۲۴۵
۲۸.....معنی خیز	صابر براری	۲۴۹
۲۹.....بے مثال احمد خاں	امیر السلام ہاشمی	۲۵۰
۳۰.....نذرِ قمر جمالی	اظہر جمالی	۲۵۲
۳۱.....قطعات نذرِ قمر جمالی	نسیم احمد نسیم	۲۵۳
۳۲.....صحرا میں شجر کو دیکھ کر	ڈاکٹر یوسف جاوید	۲۵۴

گفتگو

۳۳.....عارف شفیق سے قمر جمالی کی گفتگو	۲۵۷
آصف مالک کی قمر جمالی سے گفتگو	۲۶۱

☆☆☆

نقوش نقوی

اولاً عرض

اس دنیائے رنگ و بو میں ابتدائے آفرینش سے ہی انسانوں کی اکثریت شیطانی راہ پر بڑے فخر و غرور کے ساتھ گامزن رہی ہے ہر چند کہ اسے اشرف المخلوق ہونے کا احساس دلانے اور جہنم کا ایندھن بننے سے بچانے کے لئے کتابوں اور انبیا کو نازل و مبعوث فرمایا گیا لیکن جس کے مقدر میں تاریکیاں لکھ دی گئی ہوں وہ تجلیات سے کیسے مستفیض ہو سکتا ہے۔یہی سبب ہے کہ فرشِ زمین پر قرن ہائے قرن کی طرح آج بھی وہی لوگ زیادہ تعداد میں نظر آتے ہیں جنہیں نہ تو انسانیت کا کوئی پاس ہے اور نہ ہی تہذیبی ورثے ان کی نگاہوں میں کوئی حیثیت رکھتے ہیں ایک بھیڑ ہے جو تباہی و بربادی کے عمیق غاروں کی طرف بھاگی چلی جا رہی ہے لیکن جو کہتے ہیں کہ خدا کی زمین اچھے بندوں سے کبھی خالی نہیں رہی اگر چہ ان کی تعداد بڑی قلیل ہے لیکن وہ بڑی دلسوزی و دلجمعی سے اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنہیں نہ ستائش کی تمنا ہے اور نہ صلے کی پروا ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ خدا کے بندوں کی تکالیف اور پریشانیوں کو دور کیا جائے قمر جمالی امروہوی کا تعلق ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے اگر چہ وہ خود بار ہا صبر آزما لمحات سے گزرے ہیں لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے دوسروں کی تکالیف کو نظر انداز کیا ہو اور وہ دامے درمے سخنے گویا ہر لحاظ سے پیکرِ ایثار و قربانی کا روپ دھارے نظر نہ آتے ہوں اللہ نے ان کو شعر گوئی کی صلاحیتوں سے بھی مالا مال کیا ہے اور اس کے ذریعے بھی وہ زخموں کو مرہم فراہم کر رہے ہیں۔

اگر چہ اس دورِ احسان فراموشی میں کوئی کسی کی خدمات کا اعتراف کرنے کا روادار نہیں لیکن کچھ صاحبانِ ضمیر ایسے بھی ضرور موجود ہیں جو بلا تکلف اظہارِ حق کی جرأت رکھتے ہیں لہٰذا قلم قبیلے سے تعلق رکھنے والے کچھ دیدۂ بینا رکھنے والوں نے نہ صرف قمر جمالی امروہوی کی خدمات کو نظر میں رکھا بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعے ان کی بے لوث

انسان دوستی کو خراجِ تحسین بھی پیش کیا زیرِ نظر کتاب "سخن در سخن" ایسے لوگوں کے ہی مضامین پر مشتمل ہے جن میں قمر جمالی امروہوی کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

قمر جمالی امروہوی کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۵۴ء میں "آفریدن" کے نام سے شائع ہوا جبکہ دوسرا چوالیس سال بعد یعنی ۱۹۹۸ء میں "صحرا میں شجر" کے نام سے طبع ہو کر مقبولِ خاص و عام ہوا۔ ان کا تیسرا شعری مجموعہ بھی تقریباً تیار ہے جو بہت جلد "زخمِ آشنائی" کے نام سے منظرِ عام پر آجائے گا۔ قمر جمالی امروہوی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے جو مضامین مختلف اہلِ قلم نے تحریر کئے ہیں انہیں "سخن در سخن" کے عنوان سے زیورِ طباعت سے آراستہ کیا گیا ہے مضامین لکھنے والوں میں محسن اعظم ملیح آبادی، سحر انصاری، ڈاکٹر خیال امروہوی، پروفیسر حسنین کاظمی، بہار شاہجانپوری، خمار فاروقی، جمال نقوی، مسرور جاوید، نسیم انجم، جاوید منظر، پروفیسر ڈاکٹر سلطان، الطاف علی، روشن علی عشرت، قمر رضی، ساقی امروہوی، پروفیسر انجق اطہر، قیصر نجفی، احمد حسین صدیقی، ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی، اطہر شاہ خاں جیدی، پروفیسر فاروق فیصل، جمیل الدین فریدی، نگار فاروقی، شبنم صدیقی اور شارق بلیاوی شامل ہیں، کچھ شعرائے کرام جن میں سہیل غازی پوری، خیال امروہوی، صابر براری، امیر السلام ہاشمی، اطہر خیال، نسیم احمد نسیم، اور ڈاکٹر یوسف جاوید شامل ہیں نے قمر جمالی کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جبکہ اس کتاب میں عارف شفیق اور آصف مالک کے وہ انٹرویوز بھی شامل ہیں جو انہوں نے صاحبِ کتاب سے لئے تھے۔

پُرخلوص اور خاموش خادمانِ انسانیت کی کاوشوں کو سراہنا ایک ایسا کام ہے جسے جاری رہنا چاہیے اس طرح ان افراد کے حوصلے بلند ہوتے ہیں جو نہایت اخلاص کے ساتھ خلقِ خدا کی خدمت میں مصروف ہیں اگرچہ قمر جمالی امروہوی کو یہ بات پسند نہیں کہ ان کے فن اور خدمات کی تشہیر کی جائے لیکن وہ صدائیں جو دلوں سے بلند ہوتی ہیں انہیں کیسے دبایا جاسکتا ہے امید ہے کہ "ادارۂ سخنور" کی اس معمولی سی ادبی خدمت کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جائے گا اور اس ادارے کے فروغ و ترقی کے لئے دستِ تعاون بھی دراز کیا جائے گا تاکہ کاروانِ ادب اپنی منزلوں کی جانب پیش قدمی کرتا رہے۔

☆☆☆

محسن اعظم ملیح آبادی

قمر جمالی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ

کسی کی شخصیت کے بارے میں اظہارِ خیال اُسی صورت میں ہو سکتا ہے، جب اظہار کرنے والا خود کسی کی ذاتی زندگی کے اشغال سے کماحقہٗ واقف ہو۔ اُس کی زندگی کا مطالعہ و مشاہدہ میسر حاصل ہو۔ میں جناب قمر جمالی امروہوی کو صرف شاعر کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ وہ بھی چند برس قبل سے۔ اُن کی ذاتی زندگی اور شخصیت سے بالکل بے بہرہ ہوں۔ اُن کے احباب اور خود اُن کے تحریر کردہ مختصر تعارفی شذرے سے اِتنا علم ضرور ہو چکا ہے کہ وہ ایک شریف النفس اور نفیس انسان ہیں۔ نسلاً یوسف زئی افغان ہیں۔ برصغیر جنوبی ایشاء کے تاریخ ساز علاقے روہیلکھنڈ کے مشہور شہر مراد آباد کے مشہور و مردم خیز قصبے امروہہ کی مٹی سے اُن کا خمیر اُٹھا ہے۔ وہ تین جنوری ۱۹۲۵ء مطابق ۱۳۴۳ھ کو عدم سے وجود میں آئے۔

''امروہہ'' بھارت کے صوبے اُتر پردیش (یوپی) میں اپنے صاحبانِ علم و فضل کی وجہ سے بے حد مشہور ہے۔ اس سرزمین نے بڑی قدآور سرآمد روزگار ہستیاں پیدا کی ہیں۔ اس قصبے کی شہرت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہاں آم کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ برصغیر جنوبی ایشاء میں صرف دو ہی قصبے ایسے ہیں جو آموں کی کھان کہلاتے ہیں۔ ایک قصبہ ''ملیح آباد'' اور دوسرا قصبہ ''امروہہ'' ہے۔ جہاں سے بہت سے نئے قسم کے آموں کے قلم منگوا کر ہندو

پاک کے بہت سے علاقوں میں لگائے گئے ہیں۔ خاک امروہہ کے تعلق سے جناب قمر جمالی خود فرماتے ہیں ۔

وہ مرے فن میں جداگانہ مہک رکھتی ہے
خاک امروہہ کی خوشبو جو مری خاک میں ہے

اس قصبے کے عظیم شاعر شیخ غلام ہمدانی مصحفی کسی تعارف کے محتاج نہیں وہ اپنی ذات میں خود ایک دبستانِ شاعری تھے۔ یہ قصبہ شروع ہی سے علماء، اولیا، شعرا، سیاسی مدبرین اور حربی قوت کا مسکن ومظہر رہا ہے۔ یہاں کے باشندوں میں بھی وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کے قابلِ فخر آباء واجداد سولہویں صدی کے آخر سے روہیلکھنڈ کی حربی قوت کے معاون تھے۔ جناب قمر جمالی کے اجداد بھی اُنھی میں سے تھے۔ قمر جمالی میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد بسلسلۂ معاش دہلی شہر چلے آئے۔ یہ زمانہ ۱۹۴۱ء کے اوائل کا تھا۔ وہ ملازمت کے ساتھ تعلیمی استعداد بڑھاتے رہے، ادیب عالم کا امتحان دیا اور کمرشل آرٹ میں مصوری کا ڈپلوما حاصل کیا۔ شعر کہنے کی ابتدا، امروہہ ہی سے ہوگئی تھی کہتے ہیں انسان کی زندگی پر اس کے ماحول اور تہذیب کا اثر بہت جلد ہوتا ہے۔ امروہہ میں آئے دن مشاعرے ہوتے تھے۔ اس ادبی فضا میں سانس لینے والا لڑکا شال احمد خاں ولد جمال احمد خاں، قمر جمالی کے قلمی نام سے پہچانا جانے لگا۔ قمر جمالی ادبی وشعری نشستوں میں جاتے ضرور تھے مگر ابھی انہوں نے بطور شاعر کے مشاعروں پڑھنا نہیں شروع کیا تھا، لیکن شعری نشستوں میں شرکت کی وجہ سے ان کا شعری شعور بیدار ہو چکا تھا۔ شعر کہنے لگے، جو کچھ کہتے تھے اُسے جناب یوسف بچھرایونی کو دکھا دیتے تھے۔ جب ان کے والد جناب جمال احمد خاں یوسف زئی، چھٹیوں میں ریاست کھیڑی سے امروہہ تشریف لائے اور واپسی پر ان کو بھی اپنے ساتھ کھیڑی لے گئے۔ وہاں ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ مزید توجہ سے شعر کہنے، اور جناب مولانا شفیق احمد شفیق امروہوی سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ یہاں ان کی شاعرانہ استعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ اور کبھی کبھی مشاعروں میں بھی جانے لگے۔ جب میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تو، امروہہ واپس آ گئے، اور کچھ دنوں قیام کرنے کے بعد شہر دہلی میں بہ سلسلۂ روزگار چلے گئے اور ایک ٹینٹ (تنبو) بنانے والی کمپنی میں بحیثیت اسٹور کلرک

ملازم ہو گئے ۔ اس کمپنی کی ملازمت کے بعد امریکہ کے جنگی محکمے ایس ۔ او ۔ ایس میں ملازمت کر لی ، اور پہاڑ گنج کے علاقے میں سکونت اختیار کر لی ۔ دہلی جو علم و ادب کا مرکز تھا ۔ روزانہ کہیں نہ کہیں مشاعرہ ضرور منعقد ہوتا تھا ۔ یہاں ان کے ذوقِ شاعری کو پھیلنے کے بہت مواقع ملے ، مشقِ سخن میں گرمی آگئی ، جو کچھ کہتے ، اُس کی اصلاح ، جناب عزیز وارثی سے لے لیا کرتے تھے ۔ یوں ان کا فرسِ شاعری دوڑتا رہا ۔ علمی ، فنی میدان سر کرتا رہا ۔ حصولِ رزق کے ساتھ مشقِ سخن کو جاری رکھا ، اور آہستہ آہستہ ان کی شاعری نکھرتی گئی ۔

۲۳ ر مارچ ۱۹۴۰ء کو قرار دادِ پاکستان ہر خاص و عام نے منظور کر لی جس نے حصولِ پاکستان کی تحریک میں جان ڈال دی تھی ہر زبان پر نعرہ تھا " لے کے رہیں گے پاکستان ۔" قمر جمالی جو ایک سیماب صفت انسان ہیں ۔ بھلا خاموش کس طرح بیٹھ سکتے تھے ۔ اُن کے اندر کا انقلابی اور مشکل پسند انسان بھی مذکورہ تحریک کی جدو جہد میں اُن کو سرِ میدان لے آیا اُنہوں نے تحریکِ پاکستان کے کاروانِ آزادی میں ایک دیانتدار ، بے لوث مخلص کارکن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں ۔ قمر جمالی کسی سے پیچھے کیوں رہتے ان کی تربیت ایسے خانوادے میں ہوئی تھی جس کے بزرگوں نے ماضی میں بے مثال بہادری کی مثالیں چھوڑی تھیں ۔ حق گوئی و بے باکی ، جانبازی و جذبۂ خدمتِ ملک و ملت اور روحِ حریت تو قمر جمالی کے خون میں گردش کر رہی ہے ۔ اُن کے قابلِ فخر اجداد کی جانبازی و ایثار سینۂ روہیلکھنڈ پر ثبت ہے ۔ تاریخِ ہندوستان پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ آفاغنہ " روہیلکھنڈ " اہم حربی قوت تھے ۔ قمر جمالی خود بھی فرماتے ہیں ۔

میرے اجداد سے ورثے میں ملا ہے جو مجھے
بس وہی رنگ ابھی تک مری پوشاک میں ہے

اکتوبر ۱۹۹۸ء میں جناب آفتاب نبی آئی جی صوبہ سندھ ، کی قیام گاہ پر اُن کے محترم خسر ، ادیب الملک نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی کا چھٹا یومِ وفات اردو مجلس کے زیرِ اہتمام بیگم نادرہ آفتاب نبی (دختر خواجہ محمد شفیع) نے منایا ۔ اس اجلاس میں خواجہ موصوف پر ایک مختصر تعارفی مضمون جناب قمر جمالی نے پڑھا تھا ۔ جس میں انہوں نے بتایا تھا کہ خواجہ محمد شفیع صاحب کی حویلی میں ہر ہفتے مشاعرے اور ادبی نشستیں منعقد ہوا کرتی تھیں ۔

جن میں وہ خود بھی گاہ گاہ شریک ہوتے تھے۔

تین مارچ ۱۹۹۹ء کو خواجہ محمد شفیع کے ساتویں یوم وفات کے ضمن میں ایک عظیم الشان جلسے کا اہتمام ہوا۔ جس کی صدارت لیفٹننٹ جنرل (ریٹائرڈ) جناب معین الدین حیدر گورنر صوبہ سندھ اور موجودہ وزیر داخلہ پاکستان نے فرمائی اور مہمانِ خصوصی وفاقی وزیر مملکت جناب کیپٹن حلیم اے صدیقی تھے۔ اس جلسے کے لیے بیگم نادرہ آفتاب نبی دختر خواجہ محمد شفیع نے مشہور شاعر جناب ساجد علی ساجد کی وساطت سے خواجہ موصوف پر ایک تحقیقی مقالہ لکھنے کے لئے مجھ سے کہا۔ میں نے بڑی تحقیق کے بعد چالیس صفحات پر مشتمل ایک مقالہ لکھا۔ جس کے کچھ اقتباسات مذکورہ ساتویں جلسۂ یوم وفات میں پڑھے تھے۔ پھر ۲۶ رفروری ۲۰۰۰ء میں بیگم نادرہ کی قیام گاہ پر اردو مجلس کے زیر اہتمام خواجہ مذکور کا آٹھواں یوم وفات منایا گیا، جس میں راقم الحروف نے اپنے مذکورہ مقالۂ تحقیق کا خلاصہ پڑھا تھا۔ اسی اجلاس میں جناب قمر جمالی نے مجھے اپنے شعری مجموعے "صحرا میں شجر" کا نسخہ عطا کیا اور مختصراً تحریکِ پاکستان سے وابستگی اور دہلی میں مسلم ہندو اتحاد کے سلسلے میں اپنی خدمات کا بھی ذکر فرمایا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ قمر جمالی سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے اور جب جنگِ عظیم دوم کے بعد "نیشنل وار فرنٹ" تشکیل دیا گیا تو اس میں انہوں نے بھی ایک خاموش کارکن کی حیثیت سے دلچسپی لی اور امن سلامتی کے لیے کام کیا تاکہ ہندو مسلم فسادرونما نہ ہوسکیں۔

دہلی شہر کے کمشنر مسٹر واسکوتھ نے "نیشنل وار فرنٹ دہلی" کا منظم اعلیٰ آنجہانی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کو سونپا۔ کنور موصوف نے اسے کامیاب تر بنانے کے لئے روسائے شہر کے علاوہ شفیع دہلوی، خواجہ حسن نظامی اور دیگر روسائے شہر کے علاوہ سیاسی اور سماجی ہندو مسلم شخصیات سے تعاون کی درخواست کی خواجہ محمد شفیع دہلوی کی رہنمائی میں جناب قمر جمالی بھی بڑھ چڑھ کر خدمات انجام دیتے رہے۔

قیام پاکستان کے بعد جناب ادیب الملک نواب خواجہ محمد شفیع لاہور تشریف لے آئے۔ ۱۹۴۷ء میں جناب قمر جمالی بھی ہجرت کرکے پاکستان آگئے۔ جب تک ان کا قیام لاہور میں رہا صوفی غلام مصطفےٰ تبسم سے مشورۂ سخن فرماتے رہے۔ کراچی میں آنے کے بعد

اپنا کلام مولانا انجم فوقی بدایونی کو دکھاتے رہے۔ قمر جمالی مصوری کا اچھا ذوق رکھتے ہیں یہی وجہ ہے انہوں ایک تشہیری ادارے کی تشکیل کی اور اسی کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا۔

۱۹۵۳ء میں ان کی شادی جناب مصطفےٰ خاں کی دختر حسینہ بیگم سے ہوگئی۔ کثیر العیال ہیں ماشااللہ گیارہ اولادیں ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں ان کی رفیقۂ حیات کا سانحۂ ارتحال ہو گیا۔ جس کی وجہ سے بچوں کی پرورش و پرداخت کی ساری ذمے داری تنہا انہی کے کاندھوں پر آگئی حصولِ رزق اور پرورش اولاد، کی کٹھن ذمے داری نے انہیں ادبی مشاغل سے دور کر دیا جب اولادیں جوان ہوئیں تو دوست احباب کے اصرار پر شعر و ادب کی طرف پھر توجہ کی اور جس قدر کلام موجود تھا اس میں سے اُن کے احباب نے انتخاب کر کے مرتب کر دیا جو، ''صحرا میں شجر'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ میں نے اس مجموعے کو بالاستعیاب تنقیدی نگاہ سے پڑھا ہے۔ اس مجموعے میں کچھ بہت ہی اچھے اشعار ہیں۔ شعروں کی اچھائی کا معیار میری نظر میں اس طرح ہے۔ کچھ شعر ہر اعتبار سے بہت عمدہ ہیں۔ کچھ اشعار میں بداہت و برجستگی کی سادگی اور حسن ہے۔ کچھ شعر فکر و خیال کے اعتبار سے۔ کچھ شعر زبان کی سادگی وسلاست اور سہلِ ممتنع کی عمدگی سے معمور ہیں۔ بعض اشعار میں خبر کو، انشائی اسلوب میں بیان کر کے حسن پیدا کیا گیا ہے۔ مجموعی اعتبار سے اس مجموعے میں اچھے اشعار ہی کی تعداد زیادہ ہے۔ جن کی وضاحت آئندہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

۲۸ رنومبر ۱۹۹۸ کو جناب قمر جمالی امروہوی نے اپنا شعری مجموعہ ''صحرا میں شجر''۔ مجھے عنایت۔ بات آئی گئی ہوگئی کم فرصتی نے اس پر توجہ سے غافل رکھا۔

میرے ذہن میں جوان کی شخصیت اور سوچ نے جو خاکہ پیش کیا وہ یہ ہے کہ وہ ایک حق پسند اور بے جا تعریف سے دور رہنے والے شخص ہیں۔ دراصل نقد انتقاد اسی کا نام ہے کہ کلام کے محاسن و روائع کے ساتھ معائب و اسقام شعری پر بھی اظہار کیا جائے تا کہ اس کی روشنی کسی شاعر کا شاعرانہ مقام و مرتبہ متعین کیا جا سکے۔ مگر فی زمانہ یہ طریقہ ختم ہوتا جا رہا ہے نقاد و مبصر صاحب کلام کی خوشی کے لیے صرف محاسن و روائع پر اس لئے زور دیتے ہیں کہ خود صاحب کلام کی لاشعوری خواہش بھی یہی ہوتی ہے۔ نقاد کے تقریظی و تمہیدی تبصرے کا اس کے سوا کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا۔ عام طور پر تنقید و تبصرے جو شعری مجموعوں میں

شامل ہوتے ہیں اُن میں معائب واسقام فنی فروگزاشتوں کودانستہ نظرانداز کرنے کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے، کہ قاری کوصرف اچھے اشعار سے غرض ہوتی ہے وہ فنی وعروضی اورزبان و بیان کی باریکیوں پرنظرنہیں رکھتا، اُسے تو خیال سے مطلب ہوتا ہے۔انہی باتوں کے پیش نظر نقد نگار اپنی رائے سپردِ قلم کرتا ہے۔خود راقم الحروف بھی نقد وتبصرے میں کلام کے چہرے کا ایک رُخ ہی بیان کرتا ہے۔مجموعوں میں شامل ہونے والے تنقیدی مضامین اسی طرح کے ہوتے ہیں۔میں نے قمر جمالی کے کلام کو دیکھا ہے اور اُسی کے مطابق اظہار کردیا ہے۔اب صاحب کلام اس تنقیدی تجزیے اور جائزے کو قبول فرمائیں یارد کردیں یہ ان کا عمل ہے۔حقیقت یہ ہے کہ صحیح تنقید سے شاعر کا شاعرانہ مقام ومرتبہ کم نہیں ہوتا۔اس لیے کہ دنیا کا کوئی شاعر ایسا نہیں جس کے کلام میں کوئی کمی نہ موجود ہو۔کسی شاعر کے کلام میں اگرخوبیاں زیادہ ہیں اور اسقام کم ہیں تو وہ شاعر بہترین شاعر کے مقام پر فائز ہوتا ہے اور اگر زبان وبیان اورفن کی غلطیاں زیادہ ہیں تو اُسے عام شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔شعری مجموعہ ''صحرامیں شجر'' کو میں نے بہت کڑی تنقیدی نظر سے پڑھا ہے ان مضامین کوبھی پڑھا ہے جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔جن حضرات نے وہ مضامین لکھے ہیں وہ صاحب علم اور ثقہ لوگ ہیں۔اُنہوں نے جن زاویہ ہائے فکر کی روشنی میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے وہ صائب اور درست ہیں۔کوئی شک نہیں کہ جناب قمر جمالی نے اچھے اچھے شعر نکالے ہیں۔میری رائے مذکورہ حضرات سے الگ نہیں۔اب میں اپنی رائے جو تنقید کی کسوٹی کے تابع ہے۔سطورِ ذیل میں وضاحت سے پیش کرتا ہوں۔

جناب قمر جمالی کے بقول وہ بارہ تیرہ سال کی عمر سے شعر کہہ رہے ہیں، گویا ان کی شاعری کی عمر ساٹھ یا باسٹھ سال کے قریب ہے لیکن ان کا مجموعۂ کلام بہت مختصر ہے۔اس مجموعے میں کل ۸۶ غزلیات اور چند فردیات ہیں۔یعنی کل سات سو تینتالیس ۷۴۳ اشعار ہیں جنھیں مرتبین کلام نے غالباً انتخاب کرکے ہی کتاب کی زینت بنایا ہے۔جناب قمر جمالی نے اپنے اظہاریے میں کہیں یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ مزید کتنا کلام اور ہے جو باقی ہے۔جو کلام ''صحرامیں شجر'' کی زینت ہے وہ اردو ادبِ عالیہ کے حصۂ اول کا جو معیار اہلِ علم وفضل کی آرا، اور آفاقی ادب کی قدروں کی روشنی میں اب تک قائم ہے۔''صحرامیں شجر'' کے چالیس

پچاس اشعار سے زیادہ اس میں شامل نہیں کیے جا سکتے۔ بقیہ کلام ادب عالیہ کے حصہ دوم اور سوم میں جائیگا۔ اس روشنی میں جناب قمر جمالی صفِ اول کے شعرا کی فہرست سے نکل جاتے ہیں۔ اور ادب عالیہ کی کسوٹی اُنہیں صف دوم کے شعرا کی فہرست میں ہی جگہ دے گی۔ صف دوم کا شاعر بھی کوئی معمولی بات نہیں۔

وضاحت کرتا چلوں۔ صف اول کے شعرا شہرت و ناموری کی بنیاد پر نہیں کلام کی ندرت، اسلوب، زبان اور ادب کی آفاقی قدروں کے حامل ہونے پر شمار ہوتے ہیں۔ اردو کے عظیم اور صف اول کے حقیقی شعرا میں میرؔ، غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، مصحفیؔ، آتشؔ، میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، امیر مینائیؔ، داغؔ دہلوی، جوشؔ، اقبالؔ اور بہت سے ایسے شعرا جو مشہور نہیں ہوئے اور انہیں سراہا بھی نہیں گیا۔ مگر ان کا کلام اُن کو اہل نظر کی نظر میں صفِ اول ہی بناتا ہے۔

موجودہ دور میں تو بہت سے ایسے شعرا ہیں جو شہرت و ناموری کی بنیاد پر صفِ اول کے شاعر شمار ہونے لگے ہیں، مگر اُن کی شاعری اردو ادب عالیہ کے حصہ اول کے معیار کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے وقت اُن کو صف اول کے شعرا کی فہرست سے خارج کر دے گا۔ یہ بات دوسری ہے، لوگ اُنہیں شہرت اور پروپیگنڈے اور ذرائع ابلاغ پر چھائے ہوئے ہونے کی وجہ سے صف اول کا مان لیں، مگر عوام کی رائے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس دور بیداد کا تو یہ عالم ہے، جنھوں نے عمر بھر ایک شعر نہیں کہا دوسروں کے بل پر شاعر بنے رہے۔ انہیں بھی صف اول کے شعرا میں شمار کیا گیا۔ بہر کیف میں اپنے اصلی مقصد کی طرف آتا ہوں۔ قمر جمالی بھی اپنے دور کے بہت سے درجہ دوم کے شعرا میں شمار کیے جائیں گے۔ جو کلام اس وقت میرے سامنے ''صحرا میں شجر'' کی شکل میں ہے میری رائے جو تنقیدی کسوٹی کی روشنی میں ہے ممکن ہے ان کا آئندہ آنے والا کلام موجودہ مجموعے کے مقابلے میں زیادہ بلند اور وقیع ہو اور اس بنیاد پر صف دوم سے صف اوّل میں جگہ بنالیں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

''صحرا میں شجر'' کو میں نے بار بار پڑھا ہے۔ شعر بڑے اچھے ہیں۔ شاعر نے ایک ہی موضوع اور خیال کو جب بھی نظم کیا ہے۔ کوشش یہی کی ہے کہ بہتر سے بہتر انداز ہو۔ بعض شعر تو اپنی شعری نشتریت میں جواب نہیں رکھتے۔ مشاہداتی زندگی و داخلی

کیفیات کو موثر شعری زبان دی ہے۔ اُن کے لفظیاتِ غزل، علامات و تلازمات شعریہ بالکل نئے نہ ہونے کے باوجود اس سلیقے سے نظم ہو گئے ہیں، کہ اُن کے پامال اور پرانے ہونے کا احساس زیادہ نہیں ہوتا ہے۔ اُن کے پورے کلام میں پچاس ساٹھ شعروں کے سوا جن پر روایت کی چھاپ ہے باقی کلام نیم جدید اور جدید اسلوب ہی کا حامل ہے۔ وہ اپنے انداز بیان، فکری روش اور شاعرانہ دروبست کے اعتبار سے اور فنی لحاظ سے دبستانِ لکھنؤ کے متبع ہیں، مگر اس بات کو مدنظر رکھا جائے کہ وہ قدیم اور متوسط کے دبستانِ لکھنؤ کے پیرو نہیں بلکہ متاخرین شعرا کے دبستان سے متاثر ہیں۔ اُن کے یہاں بے محل رعائتِ لفظی، تکلف و تصنع، اور الفاظ کا بے جا گورکھ دھندا نہیں۔ اُن کے یہاں مثبت اور صالح دبستانِ لکھنؤ کی گونج سُنائی دیتی ہے۔

جناب قمر جمالی نے غالباً بہت کم کہا ہے۔ شاعری کو اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا۔ اس کے باوجود جتنا کلام "صحرا میں شجر" کے شعری خزانے میں جمع کیا ہے اس میں حالاتِ زمانہ اور ظلم واستبداد کے خلاف بھرپور آواز ہے۔ موجودہ سیاست، اُس کے مضمرات، عصبیت و علاقائیت اوطان و نسل اور زبان اور خود غرضی اور ذاتی مفادات کے رد میں بے باکی سے اپنے اشعار میں احتجاج کیا ہے۔ اُن کے ایسے اشعار میں بڑی شعلگی ہے۔ مسائل و مصائب کا بڑے عام فہم اور سادہ انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ وہ اس تناظر میں ظلم و استحصال اور آمریت کو طشت ازبام کرنے والے شعرا کی فہرست میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ظلم وستم اور مصائب پر خاموش رہنے والے شاعر نہیں۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے ظلم اور برائی کے خلاف بڑی بے باکی سے نبرد آزما ہیں، اِس روشنی میں وہ جہاد بالقلم کرنے والے شاعروں کی صف میں آتے ہیں۔ اس میں شک نہیں اُن کی شاعری مزاحمتی شاعری میں شمار ہوگی۔ وہ ترقی پسند ضرور ہیں مگر اُن کی ترقی پسندی بائیں بازو والے ترقی پسندوں کی طرح کی نہیں۔ ان کی ترقی پسندی معاندانہ نہیں احتجاجی ہے۔ جو اصلاح کی خواہش مند ہے اور مساوات حقیقی چاہتی ہے، طبقاتی رُجحان کے وہ کسی صورت میں بھی ہمنوا نہیں۔ ظلم کے خلاف اُن کا احتجاج اُن کی حق گوئی اور مزاحمت کی شہادت ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے کسی خاص نظریے اور فکر کی تبلیغ نہیں کرتے۔ ان کا مقصد ظلم وجبر کا قلع قمع اور مساوات کو عام کرنے کی

سعی ہے۔ جس میں وہ کامیاب ہیں۔

میں سطور بالا میں کہہ چکا ہوں اُن کی شاعری بہت متنوع نہیں۔ اُن کی شاعری کا کینوس محدود ہے۔ اس پر جو تصاویر اور خاکے نظر آتے ہیں وہ فکر و خیال کے اعتبار سے یکسانیت سی رکھتے ہیں۔ اُن کے مجموعے "صحرا میں شجر" کے اشعار کی تعداد ساڑھے سات کے قریب ہے، مگر مشکل سے سو، سوا سو سے زیادہ موضوع فکر و خیال کے اعتبار سے نہیں۔ ان کے شعروں میں جو بات واضح ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک بات کو جب بھی قالب شعر میں ڈھالتے ہیں، اس میں اپنے اسلوب بیان سے نیا رنگ بھرنے کی سعی کرتے ہیں۔ یہ بات ان کی شاعرانہ ہنر مندی کو ظاہر کرتی ہے۔ انسان کو جن باتوں اور خیالات سے زیادہ تعلق رہتا ہے اور جو کیفیات و جذبات اور مسائل اُس کے سامنے آتے ہیں۔ وہ خواہ فکری ہوں، خواہ جذباتی ہوں، یا مشاہداتی و سماجی۔ وہ سب اُن کی شاعری میں موجود ہیں اور نئے نئے طرز بیان کے ساتھ ہیں۔ قاری کو اُن کی شاعری کی یہ خوبی بھی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ہر شاعر اپنے ماحول کی پوری طرح صورت گری نہیں کرتا ماحول کا کوئی ایک رُخ تو ہے نہیں ہزاروں چہرے ہیں جو چہرہ شاعر کے ذہن و دل میں مرتسم ہو جاتا ہے۔ شاعر اُسے شعر میں تجسیم کر دیتا ہے۔ ہزاروں موضوعات ایسے ہیں جو ابھی تک کسی شاعر نے قالب شعر میں نہیں ڈھالے ہیں۔ سیکڑوں خیال و تصورات اور سوالات ایسے ابھرتے ہیں جو شعر کی زبان نہیں بن پاتے اور وہ شعور سے تحت الشعور میں پہنچ جاتے ہیں۔ بعض شعرا ایسے ہوتے ہیں جن کی شاعری میں بہت گہرا مطالیاتی شعور ہوتا ہے، لیکن قمر جمالی کی شاعری میں گہرے مطالیاتی شعور کا اظہار بہت کم نظر آتا ہے۔ مگر ماحول اور معاشرے کے مشاہدے سے اُبھرنے والے مناظر کا عکس پوری طرح موجود ہے۔ خیٹ حکیمانہ اور فلسفیانہ تصورات و خیالات بھی بہت کم ہیں۔ لیکن ایک بات ضرور قابل ستائش ہے۔ جس شعر میں کوئی خالص حکیمانہ خیال قلم بند ہوا ہے وہ شعریت سے عاری نہیں ورنہ دیکھنے میں آیا ہے۔ بہت سے قادر الکلام شعرا کے یہاں خیال، فلسفہ ہی نظر آتا ہے اس میں روح شعریت کی موجودگی بہت کم محسوس ہوتی ہے۔ یہ شاعری میں فلسفہ و دانش اگر اپنی خشکی کو برقرار رکھتا ہے تو یہ بات شاعر کے عجز بیان پر دلالت کرتی ہے، مگر قمر جمالی بڑی سادگی سے حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات کی یبوست کو ترو

تازگی اور خنکی میں ڈھال دیتے ہیں۔ اسی طرح انسانی نفسیات کے مطابق شعر کہنا بہت مشکل کام ہے۔ اچھا شاعر وہ ہے جو دوسروں کی نفسیات کو اپنی نفسی کیفیت میں سمو کر سب کے لیے قابل توجہ بنا دے، اور ذاتی کیفیت کو اس خوبصورتی اور دل آویزی سے بیان کر دے کہ ہر سامع اپنے دل کی دھڑکن سننے لگے شاعر کے شعری آئینے میں ہر قاری اپنی نفسیات کا چہرہ دیکھے۔ اردو کے اولین و متوسطین اور متاخرین کے شعرا میں میر تقی میر، مرزا سودا، مصحفی، نظیر، انشا، ذوق، غالب، مومن، قائم چاندپوری، داغ، امیر مینائی اور بہت سے اور موجودہ صدی کے شعرا میں، اقبال، اصغر گونڈوی، فانی، جگر، جوش، یاس یگانہ چنگیزی، فراق کے یہاں انسانی نفسیات کو بیان کرنے کی شاعرانہ ہنرمندی بدرجہ اتم موجود ہے۔ قمر جمالی اگرچہ شاعرانہ قادرالکلامی میں مندرجہ بالا شعرا کے مقابل نہیں لائے جا سکتے، مگر ان کی شاعری میں بہت سے ایسے اشعار موجود ہیں جن میں انسانی نفسیات کو سلیقے سے سمو دیا ہے، اور اُن میں بے حد نفسیاتی طرفگی ہے۔

قمر جمالی کے وہ اشعار جو چھوٹی بحور میں ہیں۔ اُن میں سے اکثر غزلیات سادگی بیان، سلاست و شگفتگی میں لاجواب ہیں۔ ان میں دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ علامتی و استعارتی و کنائی طرز بیان کے باوجود انداز سلجھا ہوا ہے گنجلک پن موجود نہیں۔ ان میں ایمائیت و رمزیت میں مفہوم کا چہرہ واضح مگر بہت پر معنی ہے۔ قمر جمالی صاحب ٹھیٹ غزل کے شاعر ہیں اُن کی غزل موجودہ دور کی غزل ہے جو اپنے منفرد حسن میں قدیم غزل سے الگ ہے ان کی غزل میں محاکاتی انداز بیاں بھی کم تر ہے اور جہاں کہیں آ گیا ہے وہ بہت خوب ہے۔ وہ بیانیہ انداز میں اپنے زندہ جذبۂ عشق و محبت، ہجر و وصال اور خواہشات کو بیان کرتے ہیں۔

محبوب کی عزتِ نفس کا احترام ملتا ہے، ابتذال اور ناشائستہ جذبات و خیالات کو اپنے اشعار میں جگہ نہیں دی ہے۔ اس ضمن میں وہ مولانا حسرت موہانی کے پیرو ہیں۔ قمر جمالی کے یہاں مصحفی یا ان کے دبستان کا اثر بالکل نہیں۔ وہ خالص جدید دور کے شاعر ہیں۔ وہ اساتذۂ قدیم و متوسطین اور متاخرین سے کسب ضیا کرنے کے باوجود نئے اسلوب کی کھڑکیوں سے نظارہ کرنے کے عادی ہیں۔ قمر صاحب کے یہاں واقعہ نگاری اور منظر نگاری کی خوبی برائے نام ہے۔ یعنی خاص منظر فطرت کی عکاسی اور اُن کا تاثر بھی برائے

نام ہے۔یعنی یہ کہ خاص مناظر فطرت پر کوئی شعر نہیں ہے۔

کسی بات کو بیان کرنے کے بہت سے ڈھنگ ہوتے ہیں اور وہ سب ڈھنگ کسی شاعر کے یہاں جمع نہیں ہو پاتے اردو کے بہت کم ایسے شعرا ہیں جن کے یہاں بیان کے رنگا رنگ طریقے ہوں۔قمر جمالی بھی اپنے خیالات وجذبات عام انداز میں بیان کرتے ہیں۔لیکن وہ عام انداز مشکل تر اسلوب ہے یعنی یہ عام انداز، سہلِ ممتنع کے تابع ہے۔سوز و گداز کو پورے تاثر کے ساتھ بیان کرنا ہر شاعر کے بس کا کام نہیں، تمام اردو شعرا کے یہاں سوز وگداز اس طرح بیان نہیں ہوسکا ہے جو اس کا حق ہے۔اشعار تو بھی شعرا کے ہاں ملیں گے، مگر اُن میں قاری یا سامع کے دل کو پگھلانے کا تاثر بدرجہ اتم موجود نہیں سوائے چند مخصوص شعرا کے۔قمر صاحب کے یہاں بھی چند شعر سوز گداز کے مل جاتے ہیں مگر زیادہ پرتاثیر نہیں جو دل کو متاثر کر کے اس کے اندر مکمل کیفیتِ غم اُبھار دیں۔

شوخیِ کلام، رندی و سرمستی بھی ہمارے اردو شعرا کا خاص موضوع رہا ہے، مگر موجودہ دور میں اِن موضوعات پر بہت کم اشعار ملیں گے۔پس قمر جمالی بھی دورِ حاضر کے شاعر ہیں ان کے یہاں بھی مذکورہ موضوعات برائے نام ہیں۔کیونکہ آج کل کا قاری اور سامع ایسے موضوعات کو پسند نہیں کرتا۔حقیقی شاعر اپنے وقت کی زبان اور دل ہوتا ہے۔لہٰذا جو بات وقت کی آواز اور تقاضا نہ ہو وہ اُسے کبھی بیان نہیں کرتا۔قمر صاحب وقت کی نبض پر انگلیاں رکھتے ہیں۔وہ زمانے کے ترجمان ہیں وہ ماضی کے غزل خواں نہیں، امروز و فردا کی دھڑکنوں کی زبان ہیں۔اور اس کا ثبوت ان کے کلام کے گہرے مطالعے سے مل جائے گا۔

جملۂ خبریہ کو جملۂ انشائیہ میں بدل دینا حسن شاعری ہے خبریہ اندازِ بیان سے زیادہ پُراثر اسلوب انشائیہ ہے۔اس کے لیے مہارت شاعرانہ کی ضرورت ہوتی ہے۔خبر کو انشائی طرز میں کہنا قمر جمالی کو بھی آتا ہے جس کی چند امثلہ آئندہ سطور میں آئیں گی۔

''صحرا میں شجر'' کے شاعر نے موجودہ دور میں اپنے معاشرے کے گرد و پیش جو بے شمار مسائل و افکار پھیلے ہوئے دیکھے ہیں۔اُن کا اثر شدت سے لیا ہے۔وہ اُن مسائل و افکار سے خواہ بذاتِ خود دوچار ہوئے ہوں، یا اُن میں اپنے سماج کے دوسرے بے شمار لوگوں کو گھرا ہوا دیکھا ہو۔دونوں کو اپنے محسوسات میں مصور کیا ہے۔ایک بالغ نظر شاعر ہونے

کے تعلق سے اُنہیں شاعرانہ نقطۂ نظر سے پرکھ کر اُن کی شعری شیرازہ بندی کی ہے۔ مطالعہ و تجربات کے علاوہ دورِ حاضر میں موثر ترین الیکٹرونک میڈیا نے تو دنیا کو بڑی حد تک سمیٹ دیا ہے۔ گویا انسان کے سامنے ایک ایسا جامِ جہاں نُما ہے کہ تصاویر کائنات اپنے ہر پہلو کے ساتھ نظر آرہی ہیں۔ یہ دنیا ہر حساس آدمی کے لیے کفِ دست ہوگئی ہے، مگر شاعر کے لیے کچھ زیادہ ہی روشن اور قابلِ توجہ ہے۔ مسائل و افکار کی رنگارنگ نت نئی صورتیں، اور خاکے ذہن و فکر کے اِسکرین پر اُبھرتے ہیں۔ پھر وہ لاشعور میں چلے جاتے ہیں اور نئی تصاویر اور چہرے متحرک نظر آنے لگتے ہیں۔ جن سے خیالات و جذبات میں وسعت و ہمہ گیری پیدا ہورہی ہے۔ مطالعہ و مشاہدہ ہی شاعر کو ایک نئے عالم میں لے جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنے افکار و خیالات کی شعری صورت گری کرتا ہے۔

قمر جمالی نے اپنے شعری مجموعے "صحرا میں شجر" کے اسکرین پر اپنے ماحول اور معاشرے کی جو موثر تصاویر اور خاکے اُبھارے ہیں۔ ان میں شعری زندگی پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے۔ اُن کے اشعار میں دل و ذہن کو اپنی گرفت میں لے لینے والی تاثیر کم نہیں۔ قمر جمالی کی غزلیات میں روایات سے زیادہ دورِ حاضر کے زندہ اور اپنی طرف بار بار کھینچنے والے تقاضے ہیں اُنکی غزلوں کے اکثر اشعار داخلی و خارجی افکار و حالات کے آئینہ دار ہیں۔ اُن کی غزلیں محض حسن و عشق کے روایتی آئینہ خانے نہیں، اُن میں احساسِ جمال بھی ہے اور فکرِ احوال بھی۔ اُن کی غزلیں ماضی سے زیادہ اپنے ماحول اور اپنے امروز و فردا ہی کا تعارف کراتی ہیں۔ اُن کی شاعری میں ایک مورخ بھی نظر آتا ہے۔ جو خبر کو انشاء میں ڈھالنا جانتا ہے۔ اُن کے یہاں مشاہدہ زیادہ متحرک نظر آتا ہے۔ اُن کی شاعری میں بڑا حصہ رجائی افکار ہی کا ہے۔ قنوطیت برائے نام ہے۔ وہ اپنے استحصالی معاشرے کے شاکی ضرور ہیں، مگر تحمل و برداشت جُرأت و ہمت کا درس بھی اشعار میں موجود ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

گھر سے منزل پہ پہنچنے کے لیے نکلے ہیں
طول کھینچے گا کہاں تک یہ سفر دیکھیں گے

وہ رہرو جنہیں اپنی منزل کی دھن ہے
وہ کب راہ کے پیچ و خم دیکھتے ہیں

قمر جمالی کا مشاہدہ ہے کہ جو لوگ آمریت و بادشاہت اور استحصالی نظام کے ضرر آمادہ نتائج کے خلاف تحریکیں چلا رہے تھے اور خاص و عام کو نبرد آزمائی کے لیے اُکسا رہے تھے۔ وہ لوگ آج خود ہی پردہ ٔجمہوریت میں آمر و مستبد ہوئے ہیں۔ محسن کشی، اور ذاتی مفاد نے معاشرتی واخلاقی اقدار سے بے بہرہ کر دیا ہے، اسلامی اخوت و یک جہتی کے بجائے زبان واوطان، نسل ونسب اور علاقائیت کے زنداں میں قید ہو گئے ہیں اور وہ ماضی کے آمروں اور قہر مانوں سے کسی طرح کم نہیں۔ دائیں بازو اور بائیں بازو کے خلفشار و انتشار نے عوام کو ذہنی و فکری طور پر تقسیم کر دیا ہے۔ فرقہ واریت کا زہر پھیلا ہوا ہے۔ نظریۂ اسلام کی حیثیت برائے نام رہ گئی ہے۔ احکامِ تشریعی و تکوینی جو دین نے بتائے ہیں اُن پر عمل کرنے کے بجائے۔ اغیار کے احکام کی پیروی ہو رہی ہے۔ آزاد کہلاتے ہیں مگر ذہناً غلام ہیں۔ بانیانِ مُلکِ خداداد کی نسل کشی کی جا رہی ہے۔ امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ قمر جمالی کی نگاہ دور اندیش و باریک بیں اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں موجودہ افکار و مسائل کو دیکھ رہی ہے۔ جنھیں وہ اپنے اشعار کی زبان میں بیان کر دیتے ہیں۔ وہ کبھی فیصلہ خود بھی سناتے ہیں اور کبھی قارئین پر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ اپنے غور و تامل پر دوسروں کو بھی سوچنے کی دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ یہی وہ حقائق ہیں جو اُن کو ایک حساس اور باخبر شاعر کی شکل میں سامنے لاتے ہیں۔ اُن کی شاعرانہ فکر ونظر کا رشتہ اپنے ماحول اور سماج سے جڑا ہوا ہے۔ اس لیے وہ سیاسی و معاشرتی، اخلاقی و ثقافتی عوامل و محرکات، مشاہدات و مسموعات کو اپنے موثر و متحرک اسلوب میں پیش کر دیتے ہیں۔ اُن کے اشعار میں تحرک اور اطراف بینی کا عکس واضح صورت میں موجود ہے۔ اُن کی شاعری دھندلی اور گہری فضا میں سانس نہیں لیتی۔ اس روشنی میں اُنھیں شاعرِ امروز و فردا کے اسکرین سے مٹا نہیں سکتے۔ اُن کی طرفگی اشعار اُنھیں افکار و مسائل کے ادراک میں مثبت رائے اور شاہینی نظر سے متصف دکھاتی ہے۔ اس تناظر میں وہ اپنے معاصرین میں ایک صاحبِ نظر مقتدر شاعر ہیں۔ اُنھوں نے بھی ہمارے اردو ادب کے سرمائے میں اضافہ کیا ہے۔ اگر ہم سچائی کے ساتھ بغیر کسی جانبداری کے اُن کا کلام دیکھیں گے تو دوسرے مشہور شعرا کی طرح ان کے یہاں بھی خوبیاں نظر آئیں گی...... اَب میں اپنے بیان اور تنقیدی تناظر کی شہادت میں اُن کے

چند شعر پیش کرتا ہوں اور فیصلہ ذی علم، شعر فہم قاری پر چھوڑتا ہوں، کہ شاعر موصوف، تنقید حیات، تنقید معاشرہ اور شاعرانہ فنکاری میں کتنے کامیاب ہیں۔ میں نے جو رائے تنقیدی اصول کے تحت اخذ کی ہے وہ کتنی صایب ہے۔ اس میں کھرے اور کھوٹے کی مقدار کا کیا تناسب ہے۔ شعروں میں کتنی شعریت، کتنی منظومیت ہے ملاحظہ کیجئے۔

تیرگی کے حریف تھے جو قمرؔ
آج وہ روشنی سے ڈرتے ہیں

سر بچانے کو، کس طرف جاؤں
ہر طرف سے تو سنگ باری ہے
کیا قیامت قریب آ پہنچی
ساری دُنیا پہ خوف طاری ہے

سوچتا ہوں کہ میرے شہر کے لوگ
نت نئے روپ کیوں بدلتے ہیں

مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے کوئی بھی
جانتا ہوں کس کا کیا کردار ہے

مشکلیں ہی مشکلیں ہیں اب تو اپنی راہ میں
جو ہمیں کل تک میسر تھی وہ آسانی گئی
جل رہے ہیں لوگ اب تو نفرتوں کی آگ میں
کیوں دلوں سے وہ محبت کی فراوانی گئی

موجودہ حالات نے جو ذہنی و قلبی، معاشرتی و معاشی، اخلاقی و روحانی اور فکر و نظر کی شکست و ریخت پیدا کر دی ہے۔ اور جو اجنبیت و بیگانگی کی دیوار درمیان میں کھڑی کر دی ہے وہ

گرائے نہیں گرتی۔

یہ کیسا دور ہے یارو کہ اَب تو
جسے دیکھو وہی شکوہ بلب ہے
اُسے یاور سمجھ بیٹھی ہے دنیا
جو دنیا کی تباہی کا سبب ہے

مری جن سے شناسائی تھی کل تک
نظر آتے ہیں وہ اَب اجنبی سے

کام لیتے تھے جو قلم سے کبھی
اُن کے ہاتھوں میں آج خنجر ہے

مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں کہہ سکتے ہیں حقائق بیان کرنے میں مصلحت کوشی سے کام نہیں لیا ہے۔ اشعار میں شعری حُسن کی نشتریت بھی معدوم نہیں۔ہاں نشتریت کم یا زیادہ ضرور ہے۔یہی بات شاعر کو ایک اچھا شاعر ثابت کرتی ہے۔

آج کا انسان کتنا مجبور ہے۔یہ مجبوری مسائلِ حاضر کی دی ہوئی ہے جس نے سچ کے بجائے مصلحت کوش بن جانے پر آمادہ کر دیا ہے۔

میں نے اس کا بھی احترام کیا
جو مرے راستے کا پتھر ہے

شہر میں ایسے لوگ بھی ہیں، کہ جو
گھر سمجھتے ہیں قید خانے کو

کیسے لکھوں اپنی روداد حیات
میرا دشمن سامنے آ جائے گا

آج کل تو ہیں سبھی بھٹکے ہوئے
کون کس کو آئینہ دکھلائے گا

◆◆

اس دورِ پُر آشوب میں مر بھی نہیں سکتے
ہر چند کہ جینا بھی یہاں کارِ زیاں ہے

یہ ضروری نہیں کہ شاعر نے جو کچھ کہا ہے وہ خود اُس کی زندگی اور شخصیت کا عکس بھی ہو۔ کسی شاعر کی تمام شاعری کا وافر حصہ خارجی عوامل و محرکات اور مشاہدات پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔ اُس کی شاعری میں جو تنوع اور ہمہ گیری نظر آتی ہے۔ وہ خارجیت ہی کی وسعت سے ملتی ہے۔ کسی شاعر کے سرمایہ شاعری کو پڑھ کر یہ اخذ کر لینا کہ یہ اُس کے داخلی جذبات و کیفیات ہیں۔ جب تک کسی شاعر کی زندگی و سیرت نقاد کے علم و مشاہدہ سے نہ گزری ہو۔ کسی شعر کے مفہوم کو خود شاعر کی زندگی پر منطبق کرنا اُس سے پوری طرح آگاہی کے بغیر ممکن نہیں۔ بس کسی شاعر کا ہر شعر تو ایک ایسا آئینہ ہے جس میں خود اُس کی تصویر بھی دکھائی دے سکتی ہے۔ اور کسی دوسرے کا چہرۂ زندگی بھی اُس میں منعکس ہوتا ہے۔ دراصل کسی شاعر کا پورا کلام اس کا ایک آئینہ خانہ ہے جہاں اندرون و بیرون مناظر و کیفیات نظر آتے ہیں۔ مثلاً مندرجہ ذیل اشعار خود شاعر کی زندگی کے آئینہ دار بھی ہو سکتے ہیں اور خارج کے صورت گر بھی۔ یعنی یہ مشاہدات و مسموعات بھی ہو سکتے ہیں اور شاعر کی اپنی زندگی کی داخلی کیفیات و جذبات بھی۔

جب کسی امتحان سے گزرے
ہم بڑی آن بان سے گزرے

◆◆

سوچتا ہوں یہ سر دار نہ لے جائے مجھے
ایک جرأت جو مری فطرتِ بے باک میں ہے

◆◆

زہر پی لیتا ہے سچا آدمی
اور سچائی کا کیا کردار ہے

وہ اپنے آپ سے نا آشنا ہے
جو دنیا کی شکایت کر رہا ہے

میں اپنی زندگی میں مشکلوں سے رنگ بھرتا ہوں
کوئی مشکل نہ ہو تو زندگی بے رنگ ہو جائے

خوف آتا ہے مجھے خود اس کا چہرہ دیکھ کر
جب بھی کوئی کسی کو آئینہ دکھلائے ہے

یہ سوچتا ہوں یہ مسئلہ کیا ہے
لوگ کیوں گھر گئے مسائل میں

قمر یہ جرم بھی کیا کم ہے میرا
کہ میں انساں کی عظمت جانتا ہوں

مندرجہ بالا اشعار جو بطور حوالے کے لکھے گئے ہیں وہ خواہ شاعر کی اپنی زندگی کی تصاویر ہوں یا مشاہدات و مسموعات کے چہرے جو اشعار کے کینوس پر ہیں، دل و دماغ دونوں کو اپنی خوبصورت معنوی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ جن میں بیان کی سادگی کے ساتھ معنوی نشتریت بھی ہے اور غنائیت بھی۔

شاعر آپ بیتی بھی بیان کرتا ہے اور جگ بیتی بھی اُس کی آپ بیتی میں، اُس سے مماثلت رکھنے والے افراد شاعر کی داخلیت کو خود پر منطبق کر کے شعر کی ہمہ گری سے لطف اُٹھاتے ہیں۔ ایک اچھے شاعر کی ہنر مندی میں مقناطیسیت ہوتی ہے۔ محبت میں جذبۂ ایثار و قربانی بھی سب سے اہم جذبہ ہے جو کسی پیش و پس کے بغیر اپنے جذبۂ عشق کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتا۔ جذبۂ محبت میں وہ کسی طرح کی مزاحمت کو توہینِ محبت جانتا ہے۔ مثلاً!

قتل ہونے کا محبت میں یہ انداز تو دیکھو!
ہم نے سر رکھ دیا مقتل میں سپر سے پہلے

وہ جذبۂ محبت جس میں شدت ہو وہ اپنے محبوب کے ہر عمل پر سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور لفظ شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ سچی محبت سپردگی چاہتی ہے سپردگی محبت کی ایسی مجبوری ہے جسے محبت کرنے والا مجبوری نہیں سمجھتا۔ نام تو ضرور وہ اس جذبے کو مجبوری کا دیتا ہے مگر اس پر دل سے راضی رہتا ہے۔

دل سے مجبور تھے ہم خدا کی قسم
ناز بے جا بھی اُن کے اُٹھاتے رہے

❖❖

کیا بتاؤں کس قدر مجبور ہوں
میں تو اپنے آپ سے بھی دور ہوں

محولہ بالا شعروں میں مجبوری سپردگی محبت کا اظہار ہے۔ محبت میں انسان اپنی ذات اپنی اَنا اور اپنی خواہشوں کو تج دیتا ہے۔ مندرجہ بالا دونوں شعر مجازی حیثیت پر منطبق ہو جاتے ہیں۔

کسی خیال کو اپنے ڈھنگ اور اُسلوب سے پیش کرنا نیا پن کہلاتا ہے۔ خیال کوئی بھی نیا نہیں ہوتا۔ قدیم شعرا میں آگاہ دہلوی کا شعر زبان زدِ عام ہے جس کی سادگی اور سلاست میں جس حکیمانہ خیال کو بیان کیا گیا ہے وہ بے مثل ہے۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

محولہ بالا شعر سے قریب تر مفہوم کو "صحرا میں شجر" کے شاعر نے اپنے انداز میں ڈھال دیا ہے اور خوب ہے، مذکورہ بالا شعر سے کسی طرح کمزور نہیں دیکھئے!

کس مسافر کو یہ اندازہ ہوا ہے اب تک
کتنا سامان ضروری ہے سفر سے پہلے

سفر آخرت کے لیے سامان سفر کی ضرورت واہمیت ہی اصل ہے کس سامان سفر کی

ضرورت ہے اس کا اندازہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ جو لوگ مسافرت میں اس کا اندازہ وادراک کر لیتے ہیں اُن کا سفر آسان ہی نہیں خوشگوار بھی ہو جاتا ہے، اور منزلِ مقصود پر کسی احتساب اور پرسش کا بھی خوف نہیں رہتا۔ اس خیال کو جناب قمر جمالی نے بڑی عمدگی اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

غالبؔ اُردو کے عظیم شعراء میں اپنی بعض خصوصیاتِ شاعرانہ میں اپنے ماسبق اور معاصرین میں بہت ممتاز تھے انہوں نے انسانی نفسیات اور فطرتِ عشق کے متعلق اچھے اچھے شعر کہے ہیں ایک غزل میں فرماتے ہیں ؎

حضرتِ ناصح، گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو، کہ سمجھائیں گے کیا

بات کوئی بہت نئی نہیں بہت معمولی خیال ہے مگر اندازِ بیان نے اس معمولی خیال کو بھی بلند کر دیا ہے اچھے شاعر کی ہنر مندی اُسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ شعری مجموعے ''صحرا میں شجر'' کے شاعر نے بھی محولہ بالا شعر میں جس خیال کو غالبؔ نے بیان کیا ہے خود بھی مندرجہ ذیل شعر میں اپنے ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔ جس میں سادگی بھی ہے روانی بھی اور ایجاز و اختصار بھی اور برجستگی بھی ؎

کیوں چلے آئے ہیں میخانے میں ان سے پوچھیے!
حضرتِ ناصح یہاں تقریر فرمائیں گے کیا

غالبؔ کے شعر کا حوالہ صرف اس لئے دیا گیا ہے کہ ایک ایسا اردو شاعر جو آفاقی قدروں کا حامل ہے اس کے شعر سے جناب قمر جمالی کے شعر کا موازنہ کرنا یا غالبؔ سے بڑھانا مقصود نہیں۔ بتانا صرف یہ ہے، کہ غالبؔ نے جس خیال کو بیان کیا ہے اس خیال کو قمر صاحب نے بھی کہا ہے جو کسی طرح کمزور نہیں اور خوب کہا ہے۔ حرفِ آخر کوئی شاعر بھی نہیں ہوتا۔ غالبؔ کی زمین میں جو شعر قمر جمالی نے کہے ہیں اُن میں سے کئی شعر اپنے خیال اور اسلوب کے اعتبار سے بہت اچھے ہیں مثلاً ؎

یاد بھی آئے ، اگر ہم کو تو ان حالات میں
وہ ہماری زندگی میں رنگ بھر جائیں گے کیا

سن کے پیغامِ بہاراں، مسکرا تو لیں، مگر
مسکرانے سے ہمارے پھول کھل جائیں گے کیا
شوقِ آزادی چمن میں لے تو آیا ہے ہمیں
ہم یہاں اپنا نشیمن بھی بنا پائیں گے کیا

یہ حقیقت ہے جن لوگوں نے ہجرت کی اُن کی نفسیاتی اور حالاتی کیفیت کو بہت سادگی و سلاست سے بیان کیا ہے۔ اسی ہجرت کے کرب کو ایک جگہ اور بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے مشرقی پاکستان اور موجودہ پاکستان میں علاقائیت، لسانیت کے باعث جو عصبیت اُبھر کر سامنے آئی ہے اُسے بہت سے شعرا نے محسوس کیا اور بیان کے عمل سے گزارا ہے۔ قمر جمالی بھی ایک حساس اور دردمند دل رکھتے ہیں اور تحریکِ پاکستان کے سپاہیوں میں شامل ہیں ان سے زیادہ اس وطن سے اور کس کو محبت ہو سکتی ہے۔ پاکستان کے موجودہ سیاسی تناظر اور حالات میں کیا ایسے خدشات دل میں نہیں لا سکتے۔ یہ خدشات فطری ہیں۔

ایک ہجرت نے تو صدیوں کا سفر روک دیا
دیس سے اَب کے بھی کیا دیس نکالا ہو گا

تحریکِ پاکستان میں جو لوگ شامل رہے ہیں اور اس کے لئے جو مصائب جھیلے ہیں اور اس کے بدلے میں جو بانیانِ پاکستان کے ساتھ سلوک روا رکھا جا رہا ہے وہ کسی کی نظر سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ اس حقیقت کو سادہ علامت کے پردے میں کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ شام و سحر کی علامت یہاں کتنی پُر معنی ہے۔

ہم نے جو معرکۂ شام و سحر دیکھا ہے
کیا کبھی تم نے بھی اے اہلِ نظر دیکھا ہے

ستم سے رونقِ مقتل بڑھا تو سکتے ہو
ستم رہا نہ اگر ستم تو کیا ہو گا

اس سے بہتر تھا اندھیرے میں بسر کر لیتے
رات کے بعد جو انجامِ سحر دیکھا

ہمیں بہار کا پروردگار کہتے ہیں
نکل گئے جو گلستاں سے ہم تو کیا ہوگا

❊❊

کس کا گلہ کرے کوئی، اپنوں کے ہاتھ سے
وہ زخم بھی لگے ہیں جو ناسور ہو گئے

مملکتِ خداداد جسے بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا تھا۔ جس کے حصول کے لیے مسلم اقلیت کے صوبوں نے جدوجہد کی، جان و مال و جائیداد کی قربانی دی، آج وہی عصبیت پرستوں کی نگاہوں میں کھٹک رہے ہیں۔ انھیں غلام بنانے کی سازش ہورہی ہے ان پر زندگی تنگ کردی گئی ہے۔ نفرت کی فضا پرورش پارہی ہے یہ روش اُس وقت تو نہیں تھی جب تحریکِ پاکستان جاری تھی۔

ایسی ذہنوں میں کثافت کبھی پہلے تو نہ تھی
آدمی آج یہ کس دشتِ خطرناک میں ہے
یہ جو مخلوق تری گردشِ افلاک میں ہے
ایسا لگتا ہے کسی سینۂ سفاک میں ہے

جب ظلم حد سے بڑھ جائے اور ہموطن ہی ہموطن کے احترام سے منکر ہوجائیں اور زبانی محبِ وطن ہونے کا نام نہاد دعویٰ۔ ذاتی مفادات، ضمیر فروشی، اغیار کی دوستی پر فخر، خودکو وارثِ مملکتِ خداداد سمجھ لینا جیسی قبیح اور اتحاد و یک جہتی اور مذہبی بالادستی کو پس پشت ڈال کر صرف اپنا اپنا کی رٹ لگانا اور تیرا میرا کی نفرت آفریں روش سے جو حالات سامنے آتے ہیں انھیں بغاوت کہتے ہیں، حالانکہ وہ بغاوت نہیں اپنا تحفظ شخصیت ہے۔ تحفظ شخصیت کو مجروح خواہ اپنے لوگ کریں یا اغیار، ان سے دور ہوجانا ہی ایک راستہ ہوتا ہے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کی مثال سامنے ہے۔

تھک کے بغاوت کر بیٹھے ہم
آخر ظلم کہاں تک سہتے

مندرجہ بالا شعر عمل کا ردِعمل پیش کرتا ہے۔ جب بھائی بھائی کا حق غصب کرنے

گے تو انجام، شعر محولہ بالا کے مطابق ہوتا ہے۔

کہیں ایسا نہ ہو اک روز یہ شعلہ بن جائے
ایک آنسو جو میرے دیدۂ نمناک میں ہے

تحریکِ پاکستان کا اجراء حقوق کا سلب ہونا، احترامِ انسانیت کی نفی، ہموطن ہونے کا عمل بطلانِ زبان سے نفرت، جیسے خطرناک اسباب تھے، جن کی بنیاد پر ہندوستان کے تمام علاقوں کے مسلمان ضرور ناً بھی متحد ہو گئے تھے۔ حالانکہ تحریکِ پاکستان کی جدوجہد میں کئی صوبوں نے دل سے ساتھ نہیں دیا جس کا ذکر پاکستان کی بے لاگ تاریخوں میں ملے گا، مگر اللہ کی مہربانی سے مسلمانانِ ہند کی کوششیں کامیاب ہوئیں، پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا اس کے لیے لاکھوں مسلمانوں نے اپنے جان و مال کی قربانی دی اور ہندو اکثریت کے علاقوں سے ہجرت کر کے اپنے بنائے ہوئے وطن میں آ گئے مگر ڈھاک کے تین پات، کیا ملا۔ جس بات پر جدوجہدِ پاکستان ہوئی اس کے بعد بھی یہاں حقوق کا سلب کرنا ذاتی مفادات اور عصبیت وجہِ نفاق بن گئی ہے۔ اس حیثیت کو قمر جمالی نے نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔

دوستی کا سبب بھی وہی بات تھی
دشمنی اُن سے جس بات پر ہو گئی

عصبیت اور علاقائیت کے متوالے لاکھ جتن کر لیں جن لوگوں نے اس وطن کے لیے سب کچھ قربان کر دیا ہے۔ اس کی سالمیت کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے جن کے خون میں حب وطن کی تب و تاب ہے وہ اس کے لیے ہمیشہ سینہ سپر رہیں گے، جنھوں نے اس مملکتِ خداداد کے لیے خون کا ایک قطرہ نہیں بہایا وہ ملک سالمیت اور آزادی کی قدر بھلا کیا کریں گے۔ قدر تو وہ لوگ کرتے ہیں جو محبِ وطن ہیں اور وہی اس کی سالمیت کے لیے ہر قربانی پیش کرتے ہیں۔ قمر جمالی بھی وطن پرست ہیں وہ کہتے ہیں۔

جان دیدیں گے اس چمن کے لیے
ہم نشیمن جلا کے آئے ہیں

جھوٹ اور پیچ مکر و فریب اور سادگی و معصومیت کبھی نہیں چھپتی آج جو لوگ ملک و

ملت کی پائمالی پر، مگر مچھ کے آنسو بہا رہے ہیں انہیں لوگوں نے اپنے ذاتی مفادات کے لیے وطن کو جاہی و بربادی سے ہمکنار کر دیا ہے۔ صرف شاعر اپنے ہی ملک کے آئینے میں دُنیا کے بہت سے ایسے ممالک کی تصویر بھی پیش کر رہا جو نام نہاد رہنماؤں حاکموں اور جاگیر داروں کے مفادات کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں، برائے نام آزادی ہے، اصل حاکم اغیار ہیں اور مفاد پرستوں کے پس پردہ حکمرانی کر رہے ہیں ۔

وہی ہیں لوٹنے والے شباب لالہ وگل
جو رو رہے ہیں گلستاں کی پائمالی پر

شباب لالہ وگل کا استعار اوطن کے لوگ ہیں اور گلستاں کا استعار اوطن کے لیے ہے شاعر کی نظر جو دیکھتی ہے اُس کو خوبصورت مگر سامنے کی علامات میں بیان کر دیتا ہے تاکہ معمولی استعداد کا قاری بھی سمجھ لے،

شاعر علامتی انداز میں اَپنے ملک اور دنیا کے بہت سے تباہ حال ممالک کی تاریخ لکھ رہا ہے جس سے کوئی ناواقف نہیں۔

شاعر کو اپنے وطن سے محبت ہے وہ جانتا ہے اسے کتنی قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے مگر اپنے ہی ملک کے بہت سے ناعاقبت اندیش لوگوں کی وجہ سے اس کی ساق کو خطرہ لاحق ہے۔ اس کا دل بے قرار ہو جاتا ہے اور جذبات شعر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ہے۔

قمرؔ ہم اس کے لیے جان دے دیں گے
جو آنچ آئی کبھی پرچم ہلالی پر

شعر مندرجہ بالا میں پرچم ہلالی کہہ کر واضح کر دیا گیا ہے کہ شاعر، پاکستان کا ہے اور وطن پرست ہے ۔

چمن اُجڑنے کا شکوہ کریں تو کیسے کریں
کیا ہی کیوں تھا بھروسا چمن کے مالی پر

مملکتِ خداداد معرضِ وجود میں آنے کے بعد بہت جلد اس کے اصل معماروں کو مفاد پرست نام نہاد محبِ وطن لوگوں نے راستے سے ہٹا دیا اور خود تختِ حکومت پر براجمان ہو گئے اور بالواسطہ اغیار کا محکوم بنا دیا۔ وہ سادہ دل اور نادان عوام جو مفاد پرستوں کے مکروفریب سے

ناواقف ہوتے ہیں اُن کی فریبانہ باتوں میں آکر انہیں اپنا رہنما چن لیتے ہیں اور پھر جو کچھ وہ اغیار کے اشارے پر کرتے ہیں اس کا رونا روتے ہیں۔ خود کردہ را علاج نیست۔ کس خوبی سے شاعر نے غلط انتخاب اور نا قابلِ یقین بھروسے کو بے نقاب کیا ہے۔

سانحہ مشرقی پاکستان کو تاریخ کیسے بھلا دے گی۔ ان کی مسلسل حق تلفی نے کیا گل کھلایا، سقوطِ ڈھاکا ایک منظم سازش کے تحت کرایا گیا اور اس میں اپنے ہی وطن کے مفاد پرستوں کا ہاتھ تھا۔ جو لوگ وہاں مصائب میں مبتلا ہوئے ایک ہجرت کے بعد دوسری ہجرت کرنی پڑی، عزت وآبرو جان ومال بھی قربان کرنا پڑا، اور ان کا کوئی پرسانِ حال نہ ہوا، اس بات کو کس قدر آسان الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔

کیسا بے گھر دیا گیا ہے مجھے
در بدر کر دیا گیا ہے مجھے

ایک ہجرت نے تو صدیوں کا سفر روک دیا
دیس سے اب کے بھی کیا دیس نکالا ہوگا

ہر سمت نفسا نفسی کا عالم ہے اے قمرؔ
لگتا ہے اس چمن کا کوئی پاسباں نہیں

وہ بانیانِ پاکستان جن کی انتھک جدوجہد سے یہ وطن معرضِ وجود میں آیا انھیں کو عصبیت پرستوں نے نظر انداز کر دیا ہے۔ سیاست میں، قیادت میں، بے دست وپا کر دیا گیا۔ اصل محبِ وطن افراد کو مشکوک نظروں سے دیکھا جانے لگا ہے۔ اُن کی ہنر مندی کو بے ہنری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وطن سے اُن کی محبت کو مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

میں تو پھل دار پیڑ تھا کل تک
بے ثمر کر دیا گیا ہے مجھے
بس یہ پہچان ہے ہنر کی مرے
بے ہنر کر دیا گیا ہے مجھے

اس سے بہتر تھا اندھیرے میں بسر کر لیتے
رات کے بعد جو انجامِ سحر دیکھا ہے

جناب قمر جمالی بڑے حساس تاریخ نگار شاعر ہیں اُن کی شاعری میں ملک کے سیاسی حالات بڑی خوبی سے اشعار میں ڈھل گئے ہیں۔

جو لوگ تحریکِ آزادی میں اغیار کے ساتھ تھے اور اُن کے ساتھ وہ سادہ لوح عوام جو اگر چہ دل سے ظلم و استبداد کی حکومت سے نجات چاہتے تھے مگر اپنے ہموطنوں ہم زبانوں کے فریب میں آ کر انہی کی زبان بولتے، اپنے اور آزادیٔ وطن کی راہ میں دیوار بنے رہے، مگر سچے آزادیٔ وطن کے متوالوں نے جدو جہد جاری رکھی جس کا نتیجہ تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے۔ قمر جمالی اس کو سہلِ ممتنع میں بیان کرتے ہیں۔ جس کے اجمال میں تفصیل موجود ہے۔

جو نہ تھے اعتبار کے قابل
ہم نے ان کا بھی اعتبار کیا

اے قمر یوں کون چلتا ہے کسی کے ساتھ ساتھ
جس طرح میں چل رہا ہوں تیرگی کے ساتھ ساتھ

''صحرا میں شجر'' کے مصنف نے اپنے اشعار میں، انسان سے محبت اُس سے ہمدردی، اس کا احترام، کسی عصبیت کے بغیر کرنے کا سبق دیا ہے۔ وہ انسانی وقار کی عظمت سے واقف ہیں۔ وہ انسان دوستی کو زندگی کا اہم زینہ جانتے ہیں۔ انسان کے احترام کے بغیر انسان کو ناقص قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں صرف زبان سے انسان دوستی اور اس کے احترام کے دعوے کو ایک فریب قرار دیا ہے، اور اسے بلند انسان ہونے کی نفی کے مترادف کہا ہے۔ جب انسان اشرف المخلوق ہے تو اس کو لازم ہو جاتا ہے کہ وہ بنی نوع انسان کو دکھ نہ پہنچائے کسی کو اپنے سے کمتر نہ سمجھے۔ انسان کو صرف شکل و صورت اور عقل و شعور کی بنیاد پر اشرف نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب تک اس میں اپنے جیسوں کے احترام کا جذبہ نہ ہو، نہ وہ جذبۂ محبت و مودت، ہمدردی و اشیار کو اپنا شعار نہ بنالے، مذکورہ خوبیاں ہی انسان کو صحیح اور کامل

انسان کے منصب پر فائز کرتی ہیں۔ انسان کے اعلیٰ کردار اور انسانوں سے مساویانہ سلوک اور محبت ہی وہ جذبہ ہے جو جسم انسان میں روح کی مانند ہے۔ قمر جمالی نے اس موضوع پر بہترین شعر نکالے ہیں۔

میں دُنیا سے محبت چاہتا ہوں
وقارِ آدمیت چاہتا ہوں
میں خود مٹ جاؤں اس کا غم نہیں ہے
مٹانا صرف نفرت چاہتا ہوں

❖❖

میں نے جب خود کو خاکسار کیا
ساری دنیا نے مجھ سے پیار کیا

❖❖

شرط یہ ہے آدمیت کے تقدس کے لیے
آدمی اِنسان بھی ہو آدمی کے ساتھ ساتھ

❖❖

جرم ہے اس شہر میں اب پیار کا اظہار بھی
نفرتوں سے کوئی تو ہو بر سرِ پیکار بھی

❖❖

میں نے اُس کا بھی احترام کیا
جو مرے راستے کا پتھر ہے

❖❖

مسلک ہے محبت تو محبت کے لیے میں
اَب جاں سے گزرنے کو بھی تیار رہونگا
آئے گا کڑی دھوپ میں جب کوئی مسافر
میں اس کے لیے سایۂ دیوار رہونگا

کیا ہوگا کسی کی اُسے تکلیف کا احساس
جس شخص کو آتا نہ ہو تکلیف اُٹھانا

نفرت کے اندھیرے سے جو بچنا ہو تو یارو !
تم دیپ محبت کے ہر سمت جلانا

دوستوں کا تو ذکر کیا کیجئے
دشمنوں سے بھی میری یاری ہے

کیا محولہ بالا اشعار میں احترامِ انسانی، نفرت سے گریز، دشمنوں سے حُسنِ سلوک رواداری، لوگوں کے لیے ہمدردی، دکھ بانٹنا، غیروں کے لیے بھی تکلیف اُٹھانا، جذبۂ خاکساری، مساوات، کیا کیا نہیں ہے۔ قمر جمالی کے اشعار جو کسی نہ کسی انداز میں انسانوں ہی کے گرد گھومتے ہیں۔ اُن میں انسان ہی سے محبت، مساوات، سب کے حقوق کا لحاظ، پُر امن ماحول قائم کرنا مقصدِ شاعر ہے۔ شاعر عظمتِ انسانی، محبت میں دیکھتا ہے۔ مگر محبت کا اس دور میں قحط ہے۔ لوگوں کا محبت و اُخوت، انسانیت سے رشتہ ٹوٹتا جا رہا ہے جب وہ اس کیفیت کو دیکھتے ہیں تو اس بے حسی پر اُن کا دل غم زدہ ہو جاتا ہے اور سوچتے ہیں ۔

جل رہے ہیں لوگ آب تو نفرتوں کی آگ میں
کیوں دلوں سے وہ محبت کی فراوانی گئی

انسانیت، اُنس، رواداری، وفا، کا تصور باقی نہیں رہا، اور کہیں یہ باتیں اور خودداری بیاں بظاہر نظر آتی ہیں تو وہ حقیقی نہیں اُن میں کاروباری مزاج شامل ہو گیا ہے اصل روحِ انسانیت مفقود ہے۔ احترامِ انساں اُٹھتا جا رہا ہے ۔

یہ دوستی بھی اب تو کاروبار ہے
کون کس کا مونس و غمخوار ہے

قمر جمالی قحط الرجال کے شاکی ہیں انسانیت اور احترامِ انسانیت نام کی چیز ڈھونڈے سے نہیں ملتی، عالم نفسا نفسی ہے، اچھے لوگ ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ انسانوں

کی بھیڑ میں ہر انسان خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ وہ اس لیے ہر وقت لوگ ساتھ ساتھ ہیں مگر دلوں میں انسانیت کی روشنی نہیں ملتی، مگر کچھ لوگ پھر بھی ایسے ہیں کہ محبت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے باوجود کہ وہ دیکھ رہے ہیں معاشرہ بے حس ہے، لوگ ذاتی مفاد میں ہی اپنی فلاح دیکھتے ہیں، دوسروں کے نقصان سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔ آدمی کی آدمیت خواب وخیال ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ تمنا پوری ہی نہیں ہوتی کہ اپنے اردگرد کوئی اچھا آدمی مل جائے۔ پر وہ محبت میں مصلحت کوشی نظر آتی ہے۔ کوئی آدمی کو اپنا دوست یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کوئی آدمی کسی کو خلوص ومحبت سے دیکھتا ہی نہیں ۔

شہر میں ملتا نہیں اب کوئی ایسا آدمی
کہہ سکے جس آدمی کو کوئی اپنا آدمی

گر یہی قحطِ محبت ہے تو اک دن دیکھنا
شہر میں ناپید ہو جائے گا ہم سا آدمی

آدمی کی آدمیت کو نہ جانے کیا ہوا
اب تو ڈھونڈے سے نہیں ملتا ہے اچھا آدمی

ایسا لگتا ہے ہمیں اس شہر پر آشوب میں
آدمی کے ساتھ رہ کر بھی ہے تنہا آدمی

اے قمر ہم فخر سے انسان کہہ سکتے جسے
کاش اس بستی میں ملتا کوئی ایسا آدمی

انسان اور اس کی انسانیت کا دکھ اس لیے شاعر کو زیادہ محسوس ہو رہا ہے کہ وہ خود ہمہ محبت ہے، احترام انسان کی روح اس میں متحرک ہے مگر وہ مایوس نہیں وہ جانتا ہے محبت ایک دن رنگ لائے گی اور لوگ محبت واخوت اور احترامِ انسان کے راستے پر آجائیں گے۔

رہے گا جذبۂ دل تشنۂ لفظ وبیاں کب تک
نہ سمجھے گی خرد اہلِ محبت کی زباں کب تک

احترامِ آدمیت میں بڑی وسعت ہے، ہر انسان کا دکھ اگر دوسرا آدمی اپنا ہی مسئلہ سمجھنے لگے، کسی کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھے تو یہ بھی احترامِ انسانیت کا ایک رخ ہے۔ انفرادی مفاد کے ساتھ اجتماعی مفادات کا خیال رکھنا انسانوں سے محبت کی دلیل ہے۔

اپنی سی لگ رہی ہے ہر اک داستاں مجھے
کیسے کہوں کہ میری کوئی داستاں نہیں

مجھ کو غموں کی دھوپ میں یوں لگ رہے ہیں لوگ
جیسے کسی کے سر پہ کوئی سائباں نہیں

ہر کارواں کے ساتھ مسلسل تو میں نہیں ہوں
یاروں میں کوئی یوسفِ بے کارواں نہیں

قمر صاحب صلح ومفاہمت کی فطرت کو احترامِ انسانیت کے بہت سے پہلوؤں میں سے ایک سمجھتے ہیں اس لیے وہ ہر گروہ اور ہر معاشرے کے افراد سے تعلقات، آدمیت کے تعلق سے رکھتے ہیں۔

ممکن ہے نکل آئے ادھر کوئی مسافر
صحرا میں لگاتے چلو دو چار شجر اور

قمر صاحب ہر قسم کی عصبیت سے بلند ہو کر سوچتے ہیں، دوسروں کے نقصان کو اپنا نقصان، اور دوسروں کے فائدے کو اپنا ہی فائدہ سمجھتے ہیں۔ وہ انسان کی خدمت کر رہے ہیں۔ بلند خیال اور صلح کل افراد ماورائے دین وملت سوچتے ہیں، دنیا کا ہر مذہب انسانی احترام کا درس دیتا ہے۔ اسلام تو احترام بنی نوع انسان کو خاص طور پر لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور رواداری کی تعلیم دیتا ہے چنانچہ ''صحرا میں شجر'' میں مختلف رنگ اور انداز میں بنی نوع انسان سے محبت کرنے کے سلسلے میں شعر ملتے ہیں۔ مندرجہ بالا اشعار میں وقارِ آدمیت عزتِ نفس، بشر کا احترام، انسانوں، مصائب اور دکھوں کا احساس، ہمدردی وغمخواری کے سچے جذبات کسی نہ کسی طرح نظر آئیں گے۔ اگر سنجیدگی اور غور وتامل کے ساتھ ان کے شعری مجموعے ''صحرا میں شجر'' کا مطالعہ کرے گا تو میرے اس بیان کی شہادت دے گا اور

اس امر کا قائل ہونا پڑے گا کہ قمر جمالی نے انسان سے محبت واحترام کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے۔

جناب قمر جمالی اپنے کسی مشاہدے وخیال، جذبے اور کیفیت کو بیان کرنے کے لئے کبھی ژولیدہ بیانی سے کام نہیں لیتے۔ اُن کی سعی ہوتی ہے، اُن کی بات معمولی علمی استعداد کے قاری کی سمجھ میں آسکے۔ اور وہ اُن کی شاعری کے تناظر میں صاف اور واضح تصاویر دیکھے۔ وہ اپنی بات قاری تک پہنچانے میں آسان طریقہ اختیار کرتے ہیں، اور اس ہنر میں وہ کامیاب ہیں۔ ان کے شعری مجموعے ''صحرا میں شجر'' میں بھی کہیں ژولیدگی الفاظ، ثقل بیان، غرابت الفاظ اور ابہام والتباس نہیں۔ وہ اُن شعرا میں سے نہیں جو بھاری بھرکم الفاظ کے بوجھ میں اپنے مافی الضمیر کو دبادیں۔ وہ عام فہم، سلیس ورواں الفاظ کو ذریعۂ اظہار بناتے ہیں۔ اُن کی شاعری کی زبان سہل ممتنع سے قریب ہے اس میں شستہ ومستند روز مرہ ہے۔ ٹھیٹ ٹکسالی اردو تو نہیں جس کا شاعری میں اب رواج بھی نہیں لیکن خوبصورت اَدبی زبان ہے۔ اُن کی شاعری میں نہ تو لکھنوی اردو ہے نہ دہلوی اردو ہے۔ ان کی زبانِ شاعری دہلی اور لکھنو کا سنگم ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد اردو زبان جن تجربوں سے گزر رہی ہے اور وہ دہلوی ولکھنوی دبستانِ شاعری کی زد سے نکلتی جارہی ہے قمر جمالی پر بھی دوسرے شعرا کی طرح اس کا اثر ہوا ہے۔ قمر جمالی زبان کو جامد رکھنے والے شعرا کے قبیل سے نہیں، بلکہ زبان کو توسیع دینے والے روشن خیال شعرا میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔

سطورِ بالا میں لکھا جاچکا ہے قمر جمالی سلیس ورواں زبان میں شعر کہتے ہیں۔ اُن کی شاعری کی زبان مستند، روز مرہ ومحاورہ سے مزین ہے اُن کے شعری مجموعے میں سہل ممتنع مطلق اور سہل ممتنع سے قریب تر اشعار بھی ہیں جن میں بڑی تعداد ایسے اشعار کی ہے، جو فنی اسقام اور لفظی ومعنوی جھول سے پاک ہیں۔ چند شعر دیکھئے۔

میری ہر شام اُجالوں کے سفر میں گزرے
میری ہر صبح کو توصیحِ درخشاں کردے

﴿۴﴾﴿۴﴾

اگر چاہے کہ ہو قربت خدا سے
محبت کر محمد مصطفیٰؐ سے

بھٹک سکتا نہیں ہے وہ مسافر
جسے نسبت ہو اُن کے نقش پا سے

مندرجہ بالا حمد اور نعت کے اکثر شعر سہل ممتنع مطلق یا اس سے قریب تر ہیں۔ میں اسے ہنر مندی سے تعبیر کرتا ہوں، کیونکہ یہ آسان کام نہیں۔ بے حد روانی غنائیت اور شگفتگی ہے غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

حسن موجود تھا تخلیق بشر سے پہلے
آئینہ کوئی نہ تھا آئینہ گر سے پہلے

کس مسافر کو یہ اندازہ ہوا ہے اب تک
کتنا سامان ضروری ہے سفر سے پہلے

اپنی پلکوں پہ دیے کس نے کیے ہیں روشن
اس اندھیرے میں، مرے دیدۂ تر سے پہلے

منزل کو اُبھرنا ہے اسی گردِ سفر سے
اُڑتی رہے کچھ دیر یونہی گردِ سفر اور

ممکن ہے نکل آئے ادھر کوئی مسافر
صحرا میں لگاتے چلو دو چار شجر اور

جو ہواؤں کی زد پہ ہیں روشن
ہم نے ایسے دیے جلائے ہیں

یاد یہ بھی نہیں رہا ہم کو
کون ہیں ہم کہاں سے آئے ہیں

﴿﴾﴿﴾

شہر مقتل بنا ہوا ہے ، مگر
ہر طرف بج رہی ہے شہنائی

کراچی کے وہ شعرا جو صرف اپنی سہل ممتنع، مطلق اور ٹھیٹ زبان کی شاعری کے لیے مشہور ہیں، جناب قمر جمالی کا نام ان کے ساتھ شامل نہ کرنا ادبی بد دیانتی کے مترادف ہے۔

اکثر نقاد کسی کم مشہور اور بغیر لابی کے شاعروں پر جب کچھ لکھتے ہیں تو وہ "اصول نقد" کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ وہ گوشہ گیر اور غریب شہر شاعر کے متعلق اپنی رائے کو گول مول کر کے پیش کرتے ہیں۔ جب ان کی تنقید میں اُتر کر دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے، جس کے متعلق لکھتا ہے اُس پر کچھ نہیں لکھا اور لکھا بھی ہے تو لفظ چبا چبا کے لکھا ہے، اور فاضل گفتگو سے صفحات بھر دیے ہیں۔ ایسے مصلحت کوش ناقدین ذرائع ابلاغ پر چھائے ہوئے مشہور شعرا سے ڈرتے ہیں۔ شعری مجموعوں، اور شعری مجموعوں کی تقاریب رونمائی میں جو تقاریر اور مقالے پڑھے جاتے ہیں اُن میں شاعروں اور ان کی شاعری کے بارے میں برائے نام کچھ ہوتا ہے۔ معلوم نہیں اُن کی نقد ونظر کی کسوٹی کھرے کھوٹے کی مقدار کا صحیح تعین کیوں نہیں کرتی۔ وہ یا تو تمہیدی وتقریظی طریقہ استعمال کرتے ہیں یا بالکل غیر واضح اور مبہم انداز۔ اس طرح کی رائے کا نقد سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ایسے نقاد جو اتفاق سے شاعر بھی ہیں اُن میں سے زیادہ تر کی رائے تسلی بخش نہیں، کیونکہ اُن کے اندر کا ناقد تو خود سے بڑا کسی کو گردانتا ہی نہیں۔ پھر وہ کیسے اپنی صحیح رائے دے سکتے ہیں۔ اپنی کتابوں پر لکھوانے والے شعرا میں یہ کمی ہے، کہ وہ کسی مشہور شخص کو رائے دینے کے لئے منتخب کرتے ہیں، گویا وہ بھی رائے سے زیادہ ناقد کی شہرت سے مرعوب ہوتے ہیں چاہے وہ کچھ کہے۔ چاہے اُس نے اپنی تنقید کی مشک میں ہوا ہی بھر دی ہو، مگر صاحب کلام ہوا سے پھولی مشک کو دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ خیر یہ باتیں تو برسبیل تذکرہ آ گئی تھیں۔ ایسا ہمیشہ ہی سے ہوتا آیا

ہے اور ہوتا رہے گا۔

میں نے قمر جمالی کے کلام کو بالاستعیاب پڑھا ہے اُنھوں نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ اُن کی شعری تخلیقات میں کوئی خامی باقی نہ رہے۔ یہ بات ہر اچھے فنکار کے ذہن میں ہوتی ہے، مگر ہر انسان میں سہو ونسیان کا مادہ موجود ہے۔ لہٰذا غلطی ضرور کرتا ہے کسی تخلیق کار کی گرفت اُس وقت کی جاتی ہے جب اُس کی تخلیق کے سونے میں کھوٹ کی مقدار زیادہ ہو جائے، اگر اس میں کھوٹ کی مقدار کم ہے۔ تو اس کے، اچھا تخلیق کار ہونے میں کلام نہیں۔ کسی بھی زبان کا شاعر، ادیب، نقاد ہو، اس کا سرمایۂ تخلیق حرفِ آخر نہ فن کے لحاظ سے ہوتا ہے نہ زبان کے اعتبار سے، جھول اور سقم رہ جاتا ہے۔ قمر جمالی بھی انسان ہیں ان کے کلام میں بعض سقم ایسے ہیں جو قابلِ گرفت ہیں، اور اُن کی نشان دہی کر دی گئی ہے، مگر بات وہی ہے کہ اُن کے شعری مجموعے میں اچھے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے اور معتبر شعرا کی صف سے الگ نہیں کیے جا سکتے وہ اچھے اور شہرت یافتہ شعرا سے اپنی شاعرانہ بلوغت اور قد میں پست نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی شاعری کے کینوس پر فکر وخیال کی ندرت و علویت اور اختراعی اعتبار سے بالا قد شعری تصاویر کی کمی ہے۔ وہ بلندئ افکار کے بجائے زبان کی لطافت اور روزمرہ کے سماجی وثقافتی، جذباتی ونفسیاتی اور اخلاقی عوامل سے اُبھرنے والے موضوعات کے شاعر ہیں۔ اُن کے یہاں، حسرت موہانی، جگر، فراق اور اسی قبیل کے دوسرے شعرا کے پیروکار ہیں، مگر مذکورہ تینوں شاعر غزل کا ایک خاص مزاج رکھتے ہیں اور صاحب اسلوب ہیں۔ قمر جمالی کا اسلوب معرضِ تعمیر میں ہے۔ وہ کب اُس منطقے تک پہنچیں گے جہاں کوئی شاعر صاحبِ طرز کہلاتا ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا تعین اُن کا آئندہ آنے والا سے شعری سرمایہ کرے گا۔

جناب قمر جمالی امروہہ کے ہیں، مگر اس علمی وادبی قصبے کے ایک عظیم المرتبت شاعر جناب مصحفی مرحوم کے طرزِ شعر گوئی اور فکر وفن کا اثر جناب قمر کی شاعری پر نام کو نہیں۔ میں نے ان کے اشعار کو اس نقطۂ نظر سے بھی بڑے غور سے پڑھا، مگر وہ دبستانِ مصحفی کے طالبِ علم نہیں اُن کی شاعری اسی ڈگر پر رواں دواں ہے جو تقسیم ہند کے بعد بنی ہے۔ "صحرا میں شجر" کی بعض غزلوں کے علاوہ سب کلام نیم جدید اور جدید ہی شمار ہوگا۔ ویسے شعری

صورت گری میں جدید لکھنوی دبستانِ شاعری سے متاثر نظر آتے ہیں دہلوی انداز فکر مطلق نہیں ہے۔ وہ سوجھ بوجھ کے شاعر ہیں، زمانے کے ادبی تقاضوں اور زبان کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ یہی بات ایک ہنرمند شاعر کی علامت ہے، جدید لکھنوی انداز شاعری کی رمق جن اشعار میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے اُن میں سے چند شعر نذرِ قارئین ہیں ؎

کوئی دیکھے تو ہمارے سوزِ گریہ کا فروغ
سینۂ دریا میں موتی، دامنِ ساحل میں آگ

شمع بھی ناقص ہے سوزِ زندگی بھی ناتمام
یہ سمجھ کر میں نے دانستہ لگائی دل میں آگ

❖❖

کیسے کہوں چمن میں کوئی مہرباں نہیں
کب بجلیوں کی زد پہ مرا آشیاں نہیں

بے چین کوئی اور بھی ہوگا فراق میں
تنہا شبِ فراق مجھی پر گراں نہیں

❖❖

اپنے دامن کی طرف آنکھ اُٹھاؤ تو سہی
خود سمجھ لوگے مرے دیدۂ تر کی قیمت

اہلِ دل کے لیے کافی نہیں آیاتِ جمال
آپ آئیں تو بڑھے شام و سحر کی قیمت

❖❖

ہمیں بہار کا پروردگار کہتے ہیں
نکل گئے جو گلستاں سے ہم تو کیا ہوگا

ابھی تو نور بھی ہے ظلمتیں بھی وقت کے ساتھ
کھلے گا تم پہ خوشی کا بھرم تو کیا

جان پر کھیل کے بیٹھے ہیں نشیمن کے قریب
آج ہم حوصلۂ برق و شرر دیکھیں گے

❖❖

دل پہ جو حرف بھی تحریر نظر آتے ہیں
اشک بن کر تری تصویر نظر آتے ہیں

❖❖

سنگ باری بھی ہوئی داد سخن کے ساتھ ساتھ
اور میں پھر بھی سخن کے پھول برساتا رہا

❖❖

حسینانِ جہاں پہلو میں دل رکھتے ہیں پتھر کے
مری تقدیر لکھ دے کاتبِ تقدیر پتھر پر

❖❖

میں اس بتِ کافر کو قمرؔ ڈھونڈ رہا ہوں
دے کعبۂ دل میں جو محبت کی اذاں بھی

❖❖

یہ تو مسلک آپ کا ہے میرا یہ مسلک نہیں
آسرا دے کر کے بے آسرا کرتا ہوں میں

یہ برائی ہے تو ہونے دو برا کرتا ہوں میں
بے نوا لوگوں کو اپنا ہمنوا کرتا ہوں میں

❖❖

جگمگانے لگے تقدیر قمرؔ کی یارب
کوئی ایسی بھی کبھی رات سہانی دیدے

ملا بالا میں جو اشعار دیے گئے ہیں وہ قدیم لکھنوی انداز کے نہیں بلکہ ان میں
جدید دبستان لکھنؤ کی گونج سنائی دیتی ہے۔ وہ الفاظ کی تذکیر و تانیث کے معاملے میں بھی

لکھنؤ دبستان شاعری کے پیرو ہیں۔ لکھنؤ کے قدیم و متوسطین شعرا نے جو رعایتِ لفظی اور تقطیع پر شاعری کو گامزن کر دیا تھا، اس کی وجہ سے داخلیت کا حسن مفقود ہو گیا تھا اور خارجیت نے اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے تھے۔ جسے شعرائے متاخرین نے رفتہ رفتہ ختم کیا اور قدیم دبستانِ لکھنؤ کے فکری نصاب کو داخلیت و خارجیت کے امتزاج سے ترتیب دے کر جدید انداز اختیار کیا، لیکن عروض و فن میں اہلِ لکھنؤ کے ہاں جو شدت ہے یعنی بال کی کھال نکالنے والا انداز قمر جمالی نے اس سے پرہیز کیا ہے۔ دراصل اردو زبان کے دو ہی دبستانِ شاعری ہیں، دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ۔ "دبستانِ لکھنؤ" کی چھاپ اُتر پردیش کے اکثر شہروں کے شعرا کے کلام پر لگی ہوئی ہے۔ امروہہ کا بھی انھی میں شمار ہے۔ دبستانِ مصحفی کوئی الگ نہیں وہ بھی دبستانِ لکھنؤ کا ہی تتبع ہے۔ دبستانِ لکھنؤ تو شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کے دور میں تشکیل ہوا۔ اس سے پہلے صرف دبستانِ دہلی تھا، اور مصحفی بھی دبستانِ دہلی کے تتبع تھے۔ تاریخِ ادبِ اردو میں صرف دو ہی دبستانِ ادب کا ذکر ہے۔ اور وہ ہیں دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ۔

جناب قمر جمالی کی غزل کا کینوس موضوعات کے اعتبار سے بہت زیادہ وسیع نہیں ہے۔ اکثر موضوعات روزمرہ کے ہیں۔ اُنھوں نے شاید اس طرف توجہ ہی نہیں دی ہے کہ ایسے نادر و تازہ موضوعات بھی اشعار میں ڈھل جائیں جو عام ڈگر سے ہٹے ہوئے ہوں۔ اُنھوں نے جو شعری تصاویر اور خاکے بنائے ہیں ان میں سے زیادہ ایسے ہیں جو عام ہیں اور اکثر شعرا کا موئے قلم بناتا رہا ہے۔ مگر جب غور سے دیکھا جائے تو عام موضوعات کے انبار میں کہیں کہیں نیم فلسفیانہ و حکیمانہ خیالات اور فکر و نظر کی تصاویر نظر آ جاتی ہیں جو صاف اور خوبصورت طرزِ بیان کا روپ دھارے ہوئے ہیں۔ بلکہ مندرجہ ذیل شعر کتنا پُر معنی اور غور کا حامل ہے۔ اس دنیا کو آئینہ خانے کی علامت میں پیش کیا ہے۔ اور انسانی خواہشات کی دیوانگی و حکیمانہ فکر ہے، جس کو شاعر نے بڑی سادگی سے کہا ہے۔

میں آئینہ خانے میں کھڑا دیکھ رہا ہوں
اک آئینہ خانہ ہے بس آئینہ خانہ

کوئی خواہش بھی پوری نہیں ہوئی پھر بھی
خواہشوں نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے

حیات و کائنات کے معاملات اور افکار و مسائل اتنے ماورائے اور اک و شعور ہیں کہ اُن کو سمجھنے اور سمجھانے سے انسان قاصر ہے، مگر اس کے باوجود انسان نے اپنی محدود عقل کے ساتھ غور و تامل بار بار کیا ہے اور یہ عمل جب تک جاری رہے گا جب تک انسان کا وجود ہے، شعور و خرد کے فرس پر سوار رہے گا، اور منزل تک پہنچنے کے لیے تیار رہے گا، معاملاتِ حیات و کائنات کے انبار میں سب سے زیادہ نازک مسئلہ الٰہیات کا ہے۔ قمر جمالی نے اس موضوع کو بھی اپنے طور پر سوچا ہے اور اُس ذاتِ واجب الوجود کی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کی ہے اور پھر انسانی عقل و ادراک کی نارسائی کو بیان کیا ہے۔

سمجھنا اُسے چاہتا ہے زمانہ
کبھی جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے

محولہ بالا شعر خالص الٰہیائی فلسفے کا ہے، جب سے دنیا قائم ہے، انسان اپنے، خالق کے بارے میں سوچ رہا ہے، اقرار و انکار، یقین و گمان کے اتھاہ سمندر کی غواصی کر رہا ہے مگر مطلق اقرار کا صدف نظر آتا ہے نہ انکار کا، یہی نارسائی انسان کو آخر کسی ذاتِ مطلق کو ماننے پر مجبور کرتی ہے وہ کہہ اٹھتا ہے کہ افسوس محدود لامحدود کو سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک شعر اور دیکھیے جو "نحن اقرب من جبل الورید" کی تشریح کس سادہ عام فہم انداز میں ہے جسے معمولی سی معمولی استعداد کا قاری بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

اُسی کو مسلسل نظر ڈھونڈتی ہے
کہ ہو سامنے اور نظر بھی نہ آئے

یہ شعر فکر کی نارسائی اور حواسِ ظاہری و باطنی کی مجبوری کو بیان کرتا ہے۔ مگر انسان بھی بڑا ضدی ہے جستجو اور ادراک و شعور کے فرس پر سوار ہے اور منزلِ واجب الوجود تک پہنچنے کے لیے بے قرار ہے۔

کون ہے جس کی ذات روشن ہے
جس سے یہ کائنات روشن ہے

اس دیے کی ہے جستجو سب کو
جس دیے سے حیات روشن ہے

جسے تسلیم کر بیٹھا ہے اے دل
ابھی تو نے اُسے دیکھا ہی کب ہے

وہ چشم کرم جو مری جانب نگراں ہے
کوئی مجھے بتلائے کہ وہ ہے تو کہاں ہے

وہ ذات جو رہتی ہے قریب رگ جاں بھی
پاتا ہوں مسلسل اُسے اپنا نگراں بھی

مندرجہ بالا اشعار تصوف و معرفت کے حامل ہیں اور مسئلہ وحدت الوجود، (ہمہ اوست) کے آئینہ دار ہیں، جس ذاتِ ماورائے عقل کو انسان کے دل نے تسلیم کرلیا ہے، مگر وہ اس جستجو میں ہے کہ اُس کا پتہ مل جائے وہ اپنے حواس ظاہری کی آنکھ سے دیکھ لے۔ جو رگ جاں سے بھی قریب ہوتے ہوئے انسان کی نظروں سے دور ہے۔ بھلا مٹھی میں سمندر کیسے آسکتا ہے۔ حضرتِ انسان اپنی لطافتوں اور لذتوں کو بیان کرنے سے قاصر ہیں تو اپنے خالق کو جو ہمہ نور و لطافت ہے کیسے محسوس ہوسکتا ہے۔ اگر وہ حواس میں قید ہوجائے تو خالق و مخلوق میں کیا فرق رہ جائے گا۔ حواس میں نہ آنا ہی اس کے ہونے کی دلیل ہے۔ اور ہمہ اوستی فلسفے کی عکاسی کرنے والا ایک شعر اور دیکھئے جس میں ایک صوفی کے جذباتِ نظارگی سمٹ کر آگئے ہیں۔

آئینہ سامنے رکھ کر ترا دیدار کروں
مجھ میں تو اپنی تجلی کو نمایاں کردے

مجازی عاشق ہو یا حقیقی، خواہش دلوں یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کو اپنے سامنے دیکھے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ حقیقی عاشق جو یہ جانتا ہے کہ اس کا محبوب

ہمہ نور ولطافت ہے مگر اُسے اپنی ذات میں مجسم دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی آرزو ہوتی ہے کہ جب آئینہ دیکھوں تو میری صورت اسی کا جمالِ جہاں آرا دیکھے۔

شاعر جانتا ہے کہ حسنِ مطلق ہمہ وقت ہر جگہ، ہر چیز میں موجود ہے لیکن وہ بلا واسطہ مجسم ہو کر اپنا دیدار نہیں کراتا وہ بالواسطہ اپنے حسن کی جلوہ گری سے فیضیاب کرتا ہے اس لیے اُس نے اپنے حسن کو آئینہ میں پیش کر دیا ہے۔ اس کی مخلوقات میں بشر ہی وہ سب سے موثر آئینہ ہے، جس میں صفات حسنِ لازوال کی کرشمہ سازیاں دکھائی دیتی ہیں۔ آئینہ گر یعنی خالقِ کائنات نے انسان کو اپنا آئینہ بنا کر بھیجا ہے۔

حسن موجود تھا تخلیقِ بشر سے پہلے
آئینہ کوئی نہ تھا آئینہ گر سے پہلے

❖

سمجھا ہے نہ سمجھے گا محبت کے معانی
وہ دل جو اسیرِ غمِ جانانہ نہیں ہے

مندرجہ بالا شعر حقیقت ومجاز دونوں ہی صورت میں متبادر ہوتا ہے۔ مجازی سوچ رکھنے والا مجازی اور حقیقی سوچ رکھنے والا حقیقی مفہوم کو لے گا۔ عشق ومحبت کا بنیادی تصور اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتا جب تک کسی کا دل اپنے محبوب کے غمِ ہمہ گیر میں قید نہیں ہو جاتا۔ پھر غمِ محبوبِ حقیقی تو محبوبِ مجازی سے کہیں بالاتر اور ماورا ہے۔ یہ جس کی سمجھ میں آ گیا وہ اُس دُنیا کی ہر شے میں اپنے محبوب ہی کا جلوہ دیکھے گا۔ اُسے اس کے جمال کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آئے گا۔

تیری چاہت کا تو دعویٰ ہے سبھی کو لیکن
کون ہم جیسا تجھے چاہنے والا ہوگا

اس دُنیا میں کون ہے جو کسی نہ کسی صورت میں اس بات کا داعی نہ ہو، کہ اے میرے محبوب میں تجھے سب سے زیادہ چاہتا ہوں، مگر زبانی دعویٰ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ جب تک کوئی فنا فی المحبوب نہ ہو جائے اس کا دعویٰ بے دلیل ہے۔ ہم جیسا چاہنے والا جملہ ایک عاشق صادق ہی کہہ سکتا ہے جس نے اپنے محبوبِ حقیقی کی محبت میں خود کو گم کر دیا ہو،

اور خود کو ہم محبوب سمجھنے لگا ہو۔ محبوب حقیقی (رب کائنات) فرماتا ہے جو ہمارا ہو جاتا ہے ہم اُس کے ہاتھ اور زبان بن جاتے ہیں، وہ جو کچھ کرتا ہے اور کہتا ہے۔ اس میں ہماری مرضی شامل ہوتی ہے۔ وہ عاشق صادق تو پھر میر درد رحمتہ اللہ علیہ کے اس شعر کے مصداق بن جاتا ہے اور لفظ ''کھلی آنکھ'' کتنا پُر معنی ہے۔

حجابِ رُخِ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ تو کوئی پردہ نہ دیکھا

میر درد

قمر جمالی کے محولا بالا شعر میں جملہ کون ہم جیسا تجھے چاہنے والا ہوگا۔ میر درد کے شعر میں حجاب کا لفظ اور کھلی آنکھ کا لفظ اپنے اندر تصوف و معرفت کی کتنی معنویت رکھتا ہے۔ قمر جمالی نے تصوف و معرفت کے ضمن میں کچھ زیادہ شعر نہیں کہے ہیں مگر جو چند اشعار ان کے مجموعے ''صحرا میں شجر'' کے دامن میں ملتے ہیں وہ بڑے سلیقے سے کہے گئے ہیں اور مجاز و حقیقت دونوں مرحلوں پر منطبق کیے ہو سکتے ہیں مندرجہ ذیل شعر بھی پُر معنی اور گہری حقیقت کے اعتبار سے معرفت ہی کے آئینہ دار ہیں سوائے محبوب حقیقی کے عاشق صادق، نرالے انداز کا کوئی دنیا کے محبوب کا عاشق نہیں ہو سکتا۔ نہ محبوب حقیقی جتنا جانِ وفا اور نہ عاشق صادق جیسا نرالے انداز کا دیوانہ۔

ساری دنیا تجھے چاہے مگر اے جانِ وفا
تیرے دیوانے کا انداز نرالا ہوگا

ہم سا دیوانہ نہ ہو گا کوئی بھی
یوں، تو ہوں گے تیرے شیدائی بہت

حقیقی محبت، حقیقی حسن و جمال جولازوال ہو، اُس سے محبت کرنے والے کی ہوتی ہے کیونکہ اس محبت میں مادیت کی طرح مٹ جانے کی خاصیت نہیں ہوتی، جو محبت حقیقی کے منصب پر فائز ہو گیا، وہ محبوب حقیقی کا آئینہ دار بن گیا، اس کا ہر عمل پھر اپنے محبوب حقیقی کی صفات کا عکس بن جاتا ہے اس کی زبان اور ہاتھ محبوب حقیقی کے بن جاتے ہیں اُس کا ہر عمل اپنے

جناب مولانا فیب الرحمان کے ساتھ قمر جمالی اور دیگر

آغا مسعود، قمر جمالی، یاور مہدی، مسرور جاوید، نقاش کاظمی، حسنین کاظمی، اور سید قمر رضی
اعتراف کمال کی تقریب میں یاور مہدی شیلڈ دے رہے ہیں

پردۂ شاعری میں زمانے کو ہم
زندگی کے فسانے سناتے رہے

❖❖

ہے زندہ حقیقت مری روداد محبت
ماضی کی روایات کا افسانہ نہیں ہے

❖❖

ہمیشہ اُس کا فن زندہ رہے گا
ملے گر جس کے فن میں تازہ کاری

اگر کوئی شاعر کسی واردات، جذبے، مشاہدے، منظر اور حالات و کیفیت کو بیان کرنے کے لیے سادہ و مترنم زبان و بیان کے ساتھ مجاز مرسل، تعریض، رمز، تلمیح، ایما و اشارت، کنایہ (اپنی تمام اقسام) کے اور تشبیہ و استعارہ اور خاص مروجہ صنائع لفظی و معنوی کو اپنی شاعری میں لائے تو شاعری کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ شعر کی نشتریت اور میں اضافہ ہو جاتا ہے مگر شرط یہ ہے مذکورہ خوبیوں کو بطور خاص شعر کا جز نہ بنایا گیا ہو اور از خود شاعر کی مشاقی کے ذریعے آجائیں تو مزید خوبی کا باعث بن جاتی ہیں۔ قمر جمالی کے کلام میں ان خوبیوں کی کثرت تو نہیں، مگر کہیں نہ کہیں ان کا اظہار مزید ہوا۔ مذکورہ تمام خوبیاں مع اقسام تو اُن کے کلام میں صراحت سے موجود نہیں، مگر تشبیہ، استعارہ، استعارہ بالکنایہ، اور مجاز مرسل کی خوبی ان کے یہاں موجود ہے جو نہایت سلیقے سے آئی ہیں چند شعر نذر قارئین ہیں۔

ہم نے جو معرکۂ شام و سحر دیکھا ہے
کیا کبھی تم نے بھی اے اہل نظر دیکھا ہے
مجھ کو معلوم نہیں کون سا گھر ہے تیرا
لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے ترا گھر دیکھا ہے

❖❖

اپنی پلکوں پہ دیے کس نے کیے ہیں روشن
اِس اندھیرے میں مرے دیدۂ تر سے پہلے

کس مسافر کو یہ اندازہ ہوا ہے اب تک
کتنا سامان ضروری ہے سفر سے پہلے

تشنگی روح کی بجھ جائے تو مر جاتا ہے عشق
زندہ رہنے کے لیے پیاسا رہا کرتا ہوں میں

مندرجہ بالا اشعار میں تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور مجاز مرسل کسی نہ کسی صورت میں آگئے ہیں اور مزا یہ ہے کہ کسی شعر میں ان کا استعمال غیر ضروری نہیں، یہ خوبیاں بڑے سلیقے سے آئی ہیں یہ شاعر کی ہنرمندی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ چند شعر اور دیکھئے ۔

غم ہزاروں ہوں تو اس کا غم نہیں
صرف اس کی ایک انگڑائی بہت
پیش خیمہ ہے کسی طوفان کا
لو دیے کی آج تھرائی بہت

ہو جس بندے کا مسلک فقر و فاقہ
سمجھ لو بادشاہت کر رہا ہے

یہاں دونوں مسافر کی طرح ہیں
ہماری ہے نہ یہ دنیا تمہاری

دوستی کا سبب بھی وہی بات تھی
دشمنی اُن سے جس بات پر ہو گئی

کہیں ایسا نہ ہو اک روز یہ شعلہ بن جائے
ایک آنسو جو مرے دیدۂ نمناک میں ہے

حالِ دل کہہ کے بھی سکوں نہ ملا
غالباً کوئی بات باقی ہے

سار ی دنیا کے دلوں کو دعوتِ آزار ہے
اپنے ہونٹوں کو تبسم آشنا کرتا ہوں میں

میں بے گھر ہوں تو اس کا غم نہیں ہے
دلوں میں گھر تو کرتا جا رہا ہوں

سر چھپانے کوئی کہاں جائے
دھوپ جب سائبان سے گزرے

دو گھڑی آ کے آپ بیٹھیں تو
ہم بھی ہیں سایۂ شجر کی طرح
کیسے کہہ دوں کہ رات بیت گئی
جب سحر ہی نہ ہو سحر کی طرح
مجھ میں اک شخص ہمسفر کی طرح
ساتھ ہے سایۂ شجر کی طرح

جب کہیں روشنی نہیں ہوتی
تب مرے دل کا داغ جلتا ہے

اُن آنکھوں کی نیند نہ پوچھ!
بند ، ابھی میخانے ہیں

غموں کی بھیڑ میں جینا پڑے گا
ہمیں یہ زہر بھی پینا پڑے گا

محولا بالا اشعار میں کہیں تشبیہ، کہیں استعارہ، کہیں کنایہ، کہیں مجاز مرسل اور کہیں تلمیح جیسی خوبیاں ان میں موجود ہیں، مذکورہ اشعار کو پڑھنے کے بعد یہ کہیں بھی محسوس نہیں ہوتا کہ مذکورہ خوبیاں اِرداۃً اشعار میں لائی گئی ہیں۔ اگر یہ خوبیاں ارادۃً لائی جاتیں تو اس میں جو آمد کا حسن ہے وہ آورد میں بدل جاتا بداہت و برجستگی کا شعری جمال مفقود ہو جاتا مگر جتنے اشعار امثلہ میں دیے گئے ہیں اور آورد کے بھی دیکھیے جن میں مجازی و حقیقی معنی کا فرق ہے۔

آندھیوں کی زد سے جو بچ جائے گا
تیرگی میں وہ دیا کام آئے گا

❖❖

میں نے چاہا ہے ٹوٹ کر جس کو
کیسے کہہ دوں کہ وہ ستم گر ہے

❖❖

تیل جب تک دیے کے اندر ہے
لو بڑھاتے رہو تو بہتر ہے

❖❖

بسر ہوتی نہیں ہے جو کسی سے
محبت ہے مجھے اُس زندگی سے

❖❖

میں آئینہ خانے میں کھڑا سوچ رہا ہوں
اک آئینہ خانہ ہے پسِ آئینہ خانہ

❖❖

ایک مدت سے خزاں کا راج ہے
اس چمن کو آ کے مہکائے گا کون

جانے کیا آج اُس کے دھیان میں تھا
تیر اُلجھا ہوا کمان میں تھا

تشنگی روح کی ممکن ہے کہ کم ہو جائے
میں بھی پیاسا ہوں مجھے تھوڑا سا پانی دیدے

شہنائیوں کے شور میں سوچا نہ اے قمر
اک عالمِ سکوت ہے شہنائیوں کے بعد

یہاں ٹھہری ہوئی جو ایک شب ہے
وہی سب کی تباہی کا سبب ہے

کس لئے فکرِ سحر کرتے ہو
رات آئے کی سحر سے پہلے

اُن آنکھوں کی نیند نہ پوچھ
بند ابھی میخانے ہیں

ہم تو لبوں کو سی سکتے تھے
آئینے تو سب کچھ کہتے

غموں کی بھیڑ میں جینا پڑے گا
ہمیں یہ زہرِ غم پینا پڑے گا

آندھیوں کی زد سے جو بچ جائے گا
تیرگی میں وہ دیا کام آئے گا

﴾﴿

یہ چمن تو خزاں رسیدہ تھا
ہم نے آسودۂ بہار کیا

شعری مجموعے "صحرا میں شجر" کے اشعار میں کچھ تلمیحی اشعار بھی ہیں۔ وہ تلمیحات اگر چہ بہت سامنے کی اور پامال شدہ ہیں مگر شاعر نے انھیں اپنے صحیح مفہوم ہی میں استعمال کیا ہے۔ کسی معمولی سی تلمیح کے پیچھے پوری ایک تاریخ ہوتی ہے۔ اُس تاریخی تناظر ہی میں بطور استعارہ یا تشبیہ کسی کو پیش کیا جاتا ہے۔ تلمیح کو اُس کے درست پس منظر میں لانا ہی ہنر مندی ہے اور اُس ہنر مندی کو "صحرا میں شجر" کے شاعر جناب قمر جمالی نے نہایت سلیقے سے نظم کیا ہے۔ مذکورہ مجموعے میں دیگر، صنائع لفظی و معنوی بھی مل جاتے ہیں، لیکن چند شعر تلمیحی ملاحظہ فرمایئے۔

کوئی دُنیا میں خریدار نہیں ہے
میرے مالک مجھے یوسف کی جوانی دیدے

﴾﴿

ہم اُس سے راہنمائی کی کیا کریں اُمید
وہ راہبر کہ جو محتاج خود خضر کا ہے

﴾﴿

ہمارے ساتھ چل کر جو فرازِ دار تک آئے
پھر اُس کے بعد وہ بھی سرمد و منصور کہلائے

﴾﴿

ہم نے یہ مانا، کہ ہاں جرمِ وفا کرتے ہیں ہم
قرض ہے سقراط کا جس کو ادا کرتے ہیں ہم

﴾﴿

اے قمرؔ آج کی دنیا میں ہمیں جانتے ہیں
حسرتؔ و فانیؔ و اقبالؔ و جگرؔ کی قیمت

لہلہائیں جس زمیں پر حضرتِ غالبؔ کے کھیت
اُس زمیں پر دوسرے غلہ اُگا پائیں گے کیا

قحط ہے تو بس خریداروں کا ہے
آج یوسف بھی بَرِ بازار ہے

کیا پرستش کروں میں اُس بت کی
خود جو محتاج دستِ آذر ہے

قمر ہم اُس کے لیے اپنی جان دیدیں گے
جو آنچ آئی کبھی پرچمِ ہلالی پر

مندرجہ بالا اشعار میں خط کشیدہ سب تلمیحات ہیں، جو ہماری اردو کی شاعری میں کثرت سے استعمال ہوتی رہی ہیں اوران کے پس پردہ میں کوئی نہ کوئی تاریخی اوراہم واقعہ موجود ہے ان تلمیحات سے ایک بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ اُن کا اعادہ ہو جاتا ہے اورنئی نسل کے اُس قاری کے علم میں اضافہ ہوتا ہے کیونکہ بعض لوگ تلمیحات کے پس منظر سے واقف نہیں ہوتے۔ شعر کا تعلق شعور سے بھی ہے لہٰذا اُس شعر کا کیا کہنا جس میں کوئی ، ایسی بات جس سے علم میں اضافہ ہو۔ شاعری کسی ملک کی تاریخ، ثقافت، سیاست، معاشرت، مناظر اور فطری جذبات وکیفیات کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے اوراس زبان کی محافظ بھی جس میں وہ کی گئی ہے شاعری متروکات اور مروجہ الفاظ کا آئینہ بھی دکھاتی ہے یہی وجہ ہے کہ فنونِ لطیفہ میں شاعری کو تفوق حاصل ہے۔ قمر جمالی کی شاعری میں بھی بہت سے ایسے موضوعات ہیں جو آنے والے زمانوں میں تاریخی اجمال اور نقطۂ نگاہ پیش کرتی تفصیل سے اس کا تعلق

شاعری میں دل و دماغ کو گرفت میں لینے کے لیے بہت سے رنگ ہوتے ہیں جو ہر مزاج کے قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے اور اچھی شاعری اسی کا نام ہے۔ شاعری ایک ایسی وحدت ہے جس میں کثرت کے بے شمار جلوے رقص فرما نظر آتے ہیں۔ قمر جمالی بہت حساس شاعر ہیں گرم و سردِ زمانہ چشیدہ ہیں۔ اُنھوں نے اس ملکِ خداداد کو معرضِ تشکیل میں لانے والوں کے ساتھ زندگی گزاری تھی۔ لڑکپن سے ہی تحریکِ پاکستان میں کسی نہ کسی صورت شریک رہے۔ اب وہ دیکھ رہے ہیں جب سے آزادی ملی ہے۔ بانیانِ پاکستان کو سازش کر کے کنارے لگا دیا ہے۔ سچے اور ایثار پسند محبِ وطن لوگوں کی جگہ، غیر مخلص ذاتی مفاد کے خواہاں نام نہاد محبِ وطن سامنے آگئے ہیں۔ پاکستان کی تحریک اور تاریخ کو مسخ کیا جا رہا ہے۔ بہاروں کی جگہ خزاؤں نے لی ہے اور یہاں بالواسطہ اغیار حکومت کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔

ایک مدت سے خزاں کا راج ہے
اس چمن کو آ کے مہکائے گا کون

شہر ویران کر دیا ہے مرا
عجب اندازِ شہر یاری ہے

اس کو لوٹا ہے اُنہی لوگوں نے دشمن کی طرح
جن کے ہاتھوں میں گلستاں کی نگہبانی گئی

قمر سوچی تھی جن کو لالہ و گل کی نگہبانی
اُنہی ہاتھوں نے لوٹا ہے ہمیشہ گلستاں میرا

جس میں پوشیدہ ہے رہزن کا مزاج
آج تک وہ قافلہ سالار ہے

قمر جمالی اپنے وطن کے نامساعد و غیر مطمئن حالات سے مایوس نہیں۔ وہ مستقبل کے حالات سے پُر اُمید ہیں۔ رجائیت کا درس دیتے ہیں، صبر و تحمل کی طرف بلاتے ہیں، مصائب کا سامنا کرنا ہی مردانگی ہے، تکلیف کے بعد راحت ہے۔ وہ خزاں کے راج کے بجائے بہاروں کے راج کا مژدہ سناتے ہیں۔ اُن کے یہاں بے حد استقلال اور پامردی کا سبق ہے۔

رہا گلشن تو پھر اک دن بہاریں لوٹ آئیں گی
کرو تدبیر یارو اَب تو گلشن کو بچانے کی

❖❖

شہرِ سفاک میں اب راج ہے سچائی کا
لوگ اخبار میں کب ایسی خبر دیکھیں گے

قمر جمالی نے ظلم و جبر، آمریت، عصبیت، علاقائیت، لسانیت کے خلاف کھل کر آواز بلند کی ہے۔ وہ ایک بیباک اور صدق دیانت کے شاعر ہیں۔

حریتِ فکر و نظر، روحِ آزادی کی حقیقت سے آگاہ ہیں وہ ظلم پر خاموش ہو کر بیٹھنے کے خلاف ہیں۔ وہ اگر چہ ترقی پسندوں کے گروہ سے تعلق نہیں رکھتے، مگر ان کی شاعری بہت سے نام نہاد ترقی پسند شعرا سے زیادہ مزاحمتی انداز شاعری ہے، وہ نہایت سلیقے سے آمریت و بربریت کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ مساواتِ انسانی کے علم بردار۔ اُنھوں نے کسی نہ کسی صورت میں تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا ہے اور آج بھی حق و صداقت اور عصبیت کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں ان کی شاعری ظالموں کے لیے ایک تازیانہ ہے۔ وہ ایک نڈر اور بلند حوصلہ شاعر ہیں۔

اچھے شاعر کی ہنرمندی یہ ہے، کہ پامال اور معمولی مضامین کو بھی اپنے بیان کی تازگی سے اُن میں ندرت پیدا کر دیتے ہیں صرف ندرتِ خیال ہی سے کوئی شعر بلند نہیں ہوتا۔ ندرتِ بیان بھی شعریت کے ساتھ پامال اور معمولی افکار و خیالات میں جان ڈال دیتی ہے۔ قمر جمالی کے یہاں اَیسے شعروں کی خاصی تعداد ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں برجستگی بھی ہے اور ایجاز و اختصار کا حسن و جمال بھی اور بیان کا حسن بھی۔

سر چھپانے کوئی کہاں جائے
دھوپ جب سائبان سے گزرے
زندگی تو سبھی گزارتے ہیں
بات جب ہے کہ شان سے گزرے

یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے
تیری چشم عنایت چاہتا ہوں

دوستوں کی اس قدر بھرمار ہے
دشمنوں کو ڈھونڈنا دشوار ہے

میں بے گھر ہوں تو اُس کا غم نہیں ہے
دلوں میں گھر تو کرتا جارہا ہوں

کیسے ممکن ہے ،بھول جاؤں انہیں
کیا محبت بھی اختیاری ہے

رونقِ محفل ہمارے دم سے ہے
ہم نہ ہوں گے تو یہاں آئے گا کون

قمر جمالی اپنے معاصرین میں کسی بھی اچھے اور سلیقۂ بیان رکھنے والے شاعر سے توانائی بیان اور روانی اظہار میں کمزور نہیں ۔اُن کی شاعرانہ ہنرمندی اُن کے اشعار سے ظاہر ہے۔محاکاتی اور مکالماتی اندازِ بیان میں وہ زیرک شاعر کے منصب پر فائز نظر آتے ہیں۔

کہا میں نے محبت چاہتا ہوں
کہا اُس نے تیرا حسن طلب ہے

تجھ سے کیا بچھڑا مسلسل سوچتا رہتا ہوں میں
اور بھی کچھ وقت کے تیور بدل جائیں گے کیا

❖❖

ساری دنیا تجھے چاہے مگر اے جانِ وفا
تیرے دیوانے کا انداز نرالا ہوگا
تیری چاہت کا تو دعویٰ ہے سبھی کو لیکن
کون ہم جیسا تجھے چاہنے والا ہوگا

❖❖

ہم سا دیوانہ نہ ہوگا کوئی بھی
یوں تو ہیں تیرے شیدائی بہت

❖❖

تیری رسوائی کے ڈر سے لکھ نہیں پاتا قلم
داستانِ شوق کی جب ابتدا کرتا ہوں میں

❖❖

زحمتِ لطف و کرم رہنے دو
وحشتِ دل اور بھی بڑھ جائے گی
تیرے کوچے تک تو لے کر آ گئی
اور یہ قسمت کہاں لے جائے گی

❖❖

اپنی قربت میں کوئی لمحہ گزر جانے دو!
پھر جو بکھروں بھی تو تم مجھ کو بکھر جانے دو

❖❖

میں دل سے اُداسی کو نکلنے نہیں دیتا
نکلے تو کہیں کیسے لے کوئی گھر

مندرجہ بالا اشعار کی نثر کی جائے تو معمولی سی لفظی تقدیم و تاخیر ہوگی۔ بعض اشعار تو بالکل ہی نثر و نظم دونوں ہی ہیں یہ شاعر کے بیان کی خوبی میں شامل ہیں۔ ان کے شعری مجموعے "صحرا میں شجر" کی اکثر غزلیں سہل ممتنع کے اشعار سے بھی ہوئی ہیں۔ دیکھیے!

ہر شخص یہاں ہوش سے بیگانہ نہیں ہے
دنیا ہے مری جان یہ میخانہ نہیں ہے
جو لوگ کسی سے بھی محبت نہیں کرتے
ان لوگوں میں شامل تیرا دیوانہ نہیں ہے

ساری دُنیا تجھے چاہے مگر اے جانِ وفا
تیرے دیوانے کا انداز نرالا ہوگا
تیری چاہت کا تو دعویٰ ہے سبھی کو لیکن
کون ہم جیسا تجھے چاہنے والا ہوگا

مجھ کو معلوم نہیں کون سا گھر ہے تیرا
لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے ترا گھر دیکھا ہے

شرط یہ ہے آدمیت کے تقدس کے لیے
آدمی انسان بھی ہو آدمی کے ساتھ ساتھ

غم ہزاروں ہوں تو اس کا غم نہیں
صرف اُس کی ایک انگڑائی بہت
دوستی مجھ کو نہ راس آئی کبھی
دوستی میں دشمنی پائی بہت
ہم نے اُس کو بھی بجھا کر رکھ دیا

جس دیے سے روشنی پائی بہت
زندگی کا ساتھ دے کر اے قمر
ہم نے جینے کی سزا پائی بہت

محولا بالا اشعار کی غزلوں کے نہایت سلیس اور سہلِ ممتنع میں ہیں اور یہ اعتبار خیالات، حسنِ ادا، اور علامات کے بھی نہایت پر اثر ہیں اور قاری کو اپنی شعری نشتریت کی گرفت میں لے لینے والے ہیں۔ آج جو بزرگ شعرا یعنی زبان کی شستگی و شگفتگی سہلِ ممتنع کے حوالے سے مشہور ہیں اُن کے اشعار سے موازنہ کر لیجیے، قمر جمالی بھی اپنے طرزِ ادا کے حسن اور لفظوں کے انتخاب میں کسی سے کم نہیں بلکہ اُن سے شانے سے شانہ ملائے کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ شہرت و ناموری میں وہ اُن سے کم ہیں، مگر شاعرانہ عظمت اور اپنے شعری سرمائے کی قدر و قیمت میں اُن سے ذرا بھی کم نہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ شاعر موصوف کے کچھ اور شعر نذرِ قارئین کروں۔ جو صرف میرے نقد و تبصرہ کی منہ بولتی تصویر ہیں۔

پیش خیمہ ہے کسی طوفان کا
لو دیے کی آج تھرائی بہت
کوئی تو ہوتا شبِ غم کا علاج
کھل رہی ہے اَب تو تنہائی بہت
ہم سا دیوانہ نہ ہوگا کوئی بھی
یوں تو ہوں گے تیرے شیدائی بہت

جو تفسیرِ محبت کر رہا ہے
حقیقت میں عبادت کر رہا ہے
وہ اپنے آپ سے نا آشنا ہے
جو دُنیا کی شکایت کر رہا ہے

اس کو طوفان کے سپرد کرو
جس کو دعوئ ہے ناخدائی کا

❖❖

یہ اندھیرے کہاں سے اُمنڈ آئے ہیں
تم تو کہتے تھے جاگو سحر ہوگئی
میں تو تنہا چلا تھا رہِ شوق میں
گمرہی کیوں شریکِ سفر ہوگئی
ایک لمحے کو بھی دن نہ نکلا کبھی
زندگی رتجگوں میں بسر ہوگئی

اشعار مندرجہ بالا میں روزمرہ کی سلاست، شیرینی اور مترنم لہجہ، کہیں بیانیہ کہیں محاکاتی انداز، کہیں خودکلامی اپنی خوبصورت ایمائیت واشاریت کے ساتھ موجود ہے، مانا کہ خیال میں ندرت وغلویت نہیں عام اور سامنے کے خیالات ہیں، مگر ان پامال اور بار بار استعمال ہونے والے مضامین کو شاعر نے اپنے انداز کے بھرپور تاثر سے نظم کیا ہے اور کہیں تو مطلق سہلِ ممتنع، اور کہیں اُس سے قریب تر زبان میں لپیٹ دیا ہے۔ جس میں بیان کا حسن پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے۔ لکنتِ بیان کا سقم تو کسی طرح ہے ہی نہیں۔ اچھا اور زیرک شاعر ہونے کے لیے پہلی شرط زبان پر گرفت مضبوط ہونا ہے۔ اردو کے بڑے بڑے شعرا، وہ کسی دور کے ہوں۔ جن کا کلام بطور سند پیش کیا جاتا ہے۔ زبان کے معاملے میں بہت محتاط رہے۔ وہ خیال سے زیادہ صحتِ زبان پر توجہ دیتے ہیں۔ جو شاعر صحتِ زبان اور ٹکسالی روزمرہ ومحاورہ کا خیال نہیں رکھتے ماہرینِ لسانیات ولغت اُن کے بلند افکار وکلام کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اس لیے کسی شاعر کے لیے زبان کی صحت کا مسئلہ پہلی شرط ہے۔ میں نے جناب قمر جمالی کے مجموعے ''صحرا میں شجر'' کا سرمایۂ شاعری بڑی حد تک صحتِ زبان اور تلفظات کے اعتبار سے درست پایا۔ معمولی فنی اَسقام متنازع الفاظ، مسئلہ تذکیر وتانیث الگ بحث ہے، مگر قمر جمالی اس میں بھی بہت محتاط ہیں اور اردو زبان میں کثرتِ رائے، کثرتِ استعمال اور اجماع کے پابند ہیں۔

میں سطور بالا میں عرض کر چکا ہوں سہل مطلق کے سلسلے میں اضافتوں سے گریز بعض ماہرین زبانِ اردو کے خیال میں ضروری ہے، مگر میری رائے میں اور بہت سے دوسرے ماہرین زبان کے خیال میں ایسی اضافت جو بہت رواں اور عام ہو سہلِ ممتنع میں حارج نہیں۔ قمر جمالی کے یہاں بھی ایسے سہلِ ممتنع کے اشعار میں آگئی ہیں، مگر وہ اتنی سلیس اور رواں ہیں کہ اُن کا بار سہلِ ممتنع پر نہیں پڑتا۔ ایسے چند شعر اور ملاحظہ کیجئے جو روانی میں حائل نہیں۔

جب تلک میری ذات باقی ہے
رونقِ کائنات باقی ہے
طلب کائنات چھوڑ چکے
خلشِ کائنات باقی ہے
سوچتا ہوں، کہ دکھ اُٹھانے کو
کیا فقط میری ذات باقی ہے
حالِ دل کہہ کے بھی سکوں نہ ملا
غالباً کوئی بات باقی ہے
کیا بگاڑے گی گردشِ ایام
جب تیرا التفات باقی ہے

آئینے کی طرح ہو جائیں گے دل
جب یہ دنیا سادگی اپنائے گی
چھوڑ کر دنیا کو جب میں جاؤں گا
مجھ کو دنیا دیکھتی رہ جائے گی

کوئی طوفان آنے والا ہے
اب تو سب پر یہ بات روشن ہے

تری محفل سے جب بھی آئے ہیں
اک اُداسی سمیٹ لائے ہیں

❖❖❖

میں تیرے شہر میں کیسے کسی سے گفتگو کرتا
نہ کوئی ہم سخن میرا نہ کوئی ہم زباں میرا

قمر جمالی اس شہر میں ہم سخن اور ہم زبان اُن لوگوں کو سمجھتے ہیں جو اُن کے ہم خیال وہم آہنگ ہیں۔ جو محبت کی زبان سے نابلد نہیں یہ خیال اُن کے اس شعر کو زیادہ توانا فکر بناتا ہے۔ لیکن ہم سخن اور ہم زباں سے یہ مراد ہو، کہ جو زبان ذریعۂ اظہار کے لیے ہوتی ہے تو مفہوم کے اعتبار سے شعر زوردار نہیں رہتا۔ اب یہ قاری پر منحصر ہے دونوں مطالب اُسے کون سا مطلب پسند کرتا ہے۔ بلاغت تو صرف محبت کی زبان جاننے والے مفہوم میں ہے۔ اُن کے اکثر شعروں میں طرفگی، یعنی اطراف نگاہی موجود ہے۔ ہر قاری اپنی سوچ کے مطابق شعر کے مفہوم سے لطف اندوز ہوگا۔

محبت کا جذبہ نہایت خوش فہم اور پُر اُمید ہوتا ہے۔ یہ بات محبت کرنے والے کی نفسیات میں شامل ہے۔ محبت کرنے والا اپنے محبوب سے ہمیشہ اچھی توقع ہی رکھتا ہے، اس کیفیت کو شاعر کس عمدگی اور سادہ بیانی سے پیش کرتا ہے ۔

بے چین کوئی اور بھی ہوگا شبِ فراق
تنہا شبِ فراق مجھی پر گراں نہیں

❖❖❖

میں زندگی کے مصائب سے ہار بیٹھا تھا
تمہاری یاد نے بڑھ کر مجھے سنبھالا ہے

رہِ عشق میں مصائب وابتلا تو آتے ہی ہیں اُن سے کیا ڈرنا یہ تمام باتیں ایک عاشقِ صادق کے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں، اُس کا منشا تو صرف منزلِ محبوب تک پہنچنا ہے۔ راہِ محبت میں آنے والا امتحان اور مصائب کا سامنا، تو محبت کے جذبے کو مزید بڑھاتا ہے ۔

تمام عمر جنھیں حادثوں نے پالا ہے
انہی کے دم سے محبت کا بول بالا ہے

جفا پرور جفا کے بعد پچھتانے سے کیا ہوگا
مجھے تنہائیوں میں یاد فرمانے سے کیا ہوگا

میں اپنی زندگی میں مشکلوں سے رنگ بھرتا ہوں
کوئی مشکل نہ ہو تو زندگی بے رنگ ہو جائے

غموں کی بھیڑ میں جینا پڑے گا
ہمیں یہ زہر بھی پینا پڑے گا

قمر جمالی جد و جہد مسلسل کی قیمت سے واقف ہیں۔ اس لیے کسی لمحہ زندگی کو غفلت و تساہل سے گزارنے کے خلاف ہیں۔ وہ جہدِ مسلسل کے بغیر انسان کو ایک مضغۂ گوشت کے سوا کچھ نہیں سمجھتے ۔تاریخ گواہ ہے جد و جہد ہی ارتقا کا اصل جوہر ہے۔ محنت سے ہی عظمت ہے۔ چند شعر اس مضمون کے بھی دیکھئے جن میں جد و جہد مسلسل کی حقیقت کو سمیٹا گیا ہے اور حوصلہ و ہمت کو بڑھایا ہے ۔

یہ زندگی تو جہدِ مسلسل کا نام ہے
ہر لمحہ قیمتی ہے کوئی رائگاں نہیں

مصائب تو بہت تھے زندگی میں
قمر ہم نے کبھی ہمت نہ ہاری

جو ہواؤں کی زد پہ روشن ہیں
ہم نے ایسے دیئے جلائے

زندگی تو ہی ہمارے حوصلے کی داد دے
جن مصائب کا ہمیشہ سامنا کرتے ہیں ہم

❖❖

ہر کارواں کے ساتھ مسلسل سفر میں ہوں
یارو! میں کوئی یوسف بے کارواں نہیں

❖❖

گھر سے منزل پہ پہنچنے کے لیے نکلے ہیں
طول کھینچے گا کہاں تک یہ سفر دیکھیں گے
جان پر کھیل کے بیٹھے ہیں نشیمن کے قریب
آج ہم حوصلۂ برق و شرر دیکھیں گے
خدمتِ دار و رسن کرتے رہیں گے ہم بھی
جب تک اس شہر میں تذلیلِ بشر دیکھیں گے

❖❖

حادثے بھی ہیں سرِ راہ چٹانوں کی طرح
ہم بھی ناقابلِ تسخیر نظر آتے ہیں

❖❖

جب کسی امتحان سے گزرے
ہم بڑی آن بان سے گزرے
حوصلہ ہو تو حادثہ کوئی
توڑ کر بجھ چٹان سے گزرے

❖❖

کہیں تو منکشف ہو راز تیرا
میں صدیوں کی مسافت چاہتا ہوں

❖❖

اس وقت اُسے ڈھونڈ رہی ہیں مری آنکھیں
اے گردشِ دوراں مرے نزدیک نہ آنا

اپنا دل ہی ٹوٹ جائے گا تو پھر
آئینہ دنیا کو دکھلائے گا کون

روشنی کچھ تو ملے کچھ اندھیرا کم تو ہو
اک دیا ہم نے سرِ راہ جلا رکھا ہے

ہم اپنے گھر سے کہیں دور جا کے دیکھتے ہیں
چلو سفر کی صعوبت اُٹھا کے دیکھتے ہیں

مندرجہ بالا اشعار میں جہدِ مسلسل، مصائب سے مقابلہ، مردانگی، بے خوفی ابتلا وآزمائش سے نبرد آزما رہنا، اپنے مقصد کی دھن میں کسی مشکل کو آڑے نہ آنے دینا۔ کامیابی وکامرانی کے لیے مشکل سے مشکل راہ اختیار کرنا جیسے خیالات کو نہایت خوبی سے شاعر نے شعریت کا روپ دیدیا ہے۔ یہ ایک اچھے اور حساس شاعر کی ہنرمندی ہے وہ اپنے قاری کے لیے ذہنی وفکری تعمیر کے ایسے افکار کو شعروں میں ڈھالتے ہیں جو زندگی کو جہدِ مسلسل کی جانب رواں رکھے۔ شاعر کی زندگی خود جہدِ مسلسل ہمت وجرأت اور ابتلا وآزمائشِ زمانہ سے نبرد آزما رہنا شعار رہا ہے، اُنھوں نے زندگی کے کسی محاذ پر ہار نہیں مانی۔ وہ انسان کو بے خوف بنانا چاہتے ہیں تاکہ کارزارِ حیات سے انھیں پسپانہ ہونا پڑے۔ جس شاعری سے رجائیت، کامیابی، حوصلہ مندی اور مردانگی کا درس ملے وہ شاعری ہمارے اَدب کا زندہ سرمایہ کہلاتی ہے، جو شاعری انسان کو عیش پرست، کم ہمت، مصائب سے سمجھوتا کرنے پر اُکسائے وہ مردہ شاعری ہوتی ہے قمر جمالی کی فکر میں زندگی اور حوصلہ مندی کا درس ہے۔

جناب قمر جمالی مرزا غالب سے بہت متاثر ہیں۔ غالب نے ایک بہت ہی روندے ہوئے خیال کو اپنے حُسنِ بیان سے قابلِ توجہ بنا دیا اور ے کی

''گویا'' رکھ کر بڑا پر معنی بنا دیا ہے۔ اگر یہ لفظ نہ ہوتا تو غالبؔ کا شعر بھی عام سا ہوتا کیونکہ کوئی ندرتِ خیال نہیں۔ غالبؔ کا شعر ہے۔

سب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہوا
مجھ پہ ''گویا'' اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

''صحرا کے شجر'' کے شاعر نے بھی اس خیال کو دوسرے ڈھنگ سے کہا ہے اور بالکل سیدھے سادے انداز میں کہا ہے غالبؔ کے شعر میں جیسی پر معنویت ہے ویسی قمر صاحب کے شعر میں تو نہیں مگر اظہار میں سادگی اور روانی ہے۔

کیا کیجئے تلاش کسی مہربان کی
تو مہرباں نہیں تو کوئی مہرباں نہیں

شاعر قمر جمالی محبت کی زبان جانتے ہیں، اور محبت کی زبان جاننے والا اس شہر یا اس دُنیا میں کوئی بھی نہیں، محبت کی زبان کا ذکر کیے بغیر وہ محبت کی زبان کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں اُن کی شاعرانہ ہنرمندی ہے۔ یہ شعر ذو معنی ہے، شاعر نے ''ہمزبان'' کے لفظ کو بطور علامت بھی استعمال کیا ہے اور اس کے ایک معنی ''ہم خیال'' افراد بھی ہیں جو اس کے شہر میں موجود نہیں فرماتے ہیں۔

میں گفتگو کروں تو کروں کس زبان میں
اس شہر میں تو کوئی مرا ہم زباں نہیں

شاعرِ موصوف کے اشعار نہایت سادہ اور سہلِ ممتنع میں ہیں، لیکن وہ روحِ بلاغت سے خالی نہیں۔ قاری کے لیے اُن میں کشش موجود ہے۔ دیگر لوازمات شاعری بھی اُن کے اشعار میں موجود ہیں۔

مرزا غالبؔ نے اپنے ہم سخن اور ہم زباں افراد سے اُن کی اُفتادِ طبع کی خرابی کی وجہ سے اُن سے دور رہنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے فرماتے ہیں۔

رہیے اَب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

جناب قمر جمالی نے بھی ''ہم سخن'' اور ہم زباں کا ذکر کیا ہے، مگر غالبؔ نے جس

مفہوم کو بیان کیا ہے اُس کے خلاف قمر جمالی کو اپنے ہم سخن اور ہم زباں نہ ملنے کا شکوہ ہے۔
اُن کا دوسرا مصرع سوائے ضمیر متکلم "میرا" کے تمام لفظ وہی ہیں جو غالب کے دوسرے مصرے میں ہیں۔صرف مفہوم کے اعتبار سے ضد ہے۔

اگر خبر کو انشا بنا دیا جائے تو اس میں ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے۔کسی بات کے اظہار کے لیے اگر انداز بیان ایسا ہو کہ خبر بھی ہو جائے اور خبر کا انداز وضاحت کے ساتھ نہ ہو۔مثلاً غالب خبر انسانی انداز میں بیان کر کے شعر کے مفہوم کا لطف دوبالا کر رہے ہیں۔

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

یا

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

خبر کو اس طرح بیان کر دینا، خبر معلوم نہ ہو، خبر کو بیان کرنے کی اگرچہ نحوی اعتبار سے بہت سے طریقے ہیں، مگر نحوی انداز کو سمیٹتے ہوئے انشائی اسلوب خبر میں حسن پیدا کر دیتا ہے ایک شعر بطور مثال مومن خاں مومن کا دیکھئے۔

بیٹھے ہو جو پائے صنم پہ دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

ان امثلہ سے مقصد صرف یہ ہے کہ ہر قاری کی سمجھ میں معنی آجائے کہ خبر اور انشا کے اسلوب میں کیا فرق ہے۔کیونکہ حرفی و نحوی انداز سے شعر کو سمجھنا تمام قاریوں کے لیے ممکن نہیں۔جب تک وہ اس طرز بیان سے پوری آگاہی نہ رکھتے ہوں۔

جناب قمر جمالی نے بھی خبر کو انشائیہ بنا دیا ہے اُن کے یہاں ایسے اشعار مل جاتے ہیں۔خبر کو انشائی انداز میں بیان کرنا شاعر کی ہنرمندی کو ظاہر کرتا ہے۔چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔

نہ جانے کیوں تجھے چاہا تھا ٹوٹ کر میں نے
خبر نہ تھی کہ یہ رونا تو عمر بھر کا ہے

آپ آئیں تو آفتاب بدست
دیکھیں کس کا چراغ جلتا ہے

❖❖

دیوانوں سے پرسش کیا
جانتے ہو دیوانے ہیں

❖❖

آپ کو، کوئی کچھ بھی نہ کہتا
لوگ ہمیں دیوانہ کہتے
ہم تو لبوں کو سی سکتے تھے
آئینے تو سب کچھ کہتے

❖❖

نہ جانے کس لیے مانوس میرے گھر سے ہے
اُداسی رہ نہیں سکتی ہے مرے گھر کے بغیر

سطور بالا میں لکھا جا چکا ہے کہ خبر یا بیانیہ وہ جملہ ہوتا ہے جو مضمون کے متعلق، سچ یا جھوٹ کا احتمال پیدا کرنے اور جملۂ انشائیہ وہ جملہ ہوتا ہے جس میں سچ یا جھوٹ کا احتمال نہ ہو، انشائیہ انداز میں بات کہنا ہو تو اس کی متعدد قسمیں ہیں۔ مثلاً: ندا اور تخاطب، تمنا، امر، نہی، تحسین و آفریں، تعجب و استعجاب، ندبہ و تاسف، قسم، انبساط و نفریں، عرض، تنبیہ و تہدید۔ الغرض انشائی اسلوب بیان قائل دلی جذبات اور منشا کو ظاہر کرتا ہے اور اس میں فجائیہ کی تمام صورتیں آتی ہیں۔

قمر جمالی نے اپنے اشعار میں فجائی انداز میں شعر کہے ہیں اور خبر یا بیانیہ کو انشائیہ میں بدل دیا ہے مثلاً۔

دیکھئے حالات یہ اب اور دکھلائیں گے کیا
ریزہ ریزہ ہو کے ہم یوں ہی بکھر جائیں گے کیا

❖❖

شوقِ آزادی چمن میں لے تو آیا ہے مگر
ہم یہاں اپنا نشیمن بھی بنا پائیں گے کیا

کس مسافر کو یہ اندازہ ہوا ہے اب تک
کتنا سامان ضروری ہے سفر سے پہلے

ممکن ہے نکل آئے ادھر کوئی مسافر
صحرا میں لگاتے چلو دو چار شجر اور
بڑھتے رہو تخریب سے تعمیر کی جانب
سنتے ہیں کہ ترشے تو ابھرتا ہے شجر اور

اے ناظمِ میخانہ مجھے اتنا بتا دے
کیا کوئی مرے نام کا پیمانہ نہیں ہے

قیامت ہے کہ اب اک دوسرے سے
جسے دیکھو وہ نفرت کر رہا ہے

اس کو طوفان کے سپرد کرو
جس کو دعویٰ ہے پارسائی کا

بہت بڑھنے لگی ہے بے قراری
بدل ڈالو نظامِ شہریاری

چھوڑ کر دنیا کو جب جاؤں گا میں
مجھ کو دنیا دیکھتی جائے گی

کبھی تو پوچھتا مجھ سے بھی کوئی
بتا دل میں ترے ارمان کیا ہے

جانے وہ پیڑ کس نے کاٹ دیا
کل تلک جو مرے مکان میں تھا

کیا قیامت قریب آ پہنچی
ساری دنیا پہ خوف طاری ہے

غزل میں سوز و گداز، افسوس، حرماں نصیبی، تباہی، بربادی، جو عشق کے سبب سے ہو، زیادہ پر اثر ہوتی ہے صرف انداز بیان ایسا ہو کہ قاری کے دل پر ایک دم ضرب پڑے اور اُسے محسوس ہو کہ جو بیان کیا گیا ہے وہ میری حالت و کیفیت کا عکس ہے۔ لیکن قمر جمالی ٹھیٹ غزل کے شاعر ہیں۔ ایسا سوز و گداز جو میر تقی میر، مصحفی، میر سوز، جرآت، انشا، آتش اور فانی بدایونی کے یہاں ملتا ہے۔ جس میں بے حد شدت اور کرب سمٹا ہوا ہے۔ قمر صاحب کے سرمایۂ شاعری شدید سوز و گداز، یاسیت و قنوطیت، غم و الم جو شل آہ نا کشیدہ ہوں برائے نام ہیں چند شعر و یکھے جاتے ہیں جو کسی نہ کسی صورت میں تباہی، غم واندوہ، افسوس، یاسیت اور سوز و گداز کے عکاس تو ہیں مگر مذکورہ کیفیات کا شدید احساس ان کے اشعار میں موجود نہیں۔ اس کا اصل سبب یہ ہے ان کے مجموعے ''صحرا میں شجر'' کے جتنے اشعار ہیں ان میں زیادہ اشعار ایسے ہیں جن میں رجائی پہلو زیادہ ہے۔ وہ ہمت و حوصلہ، صبر و استقامت اور تحمل کو اپنے شعروں میں جگہ دیتے ہیں۔ بس یہی وجہ ہے۔ جس نے ان شعروں کو جو سوز و گداز قنوطیت، و حرماں نصیبی کے جذبے کے تحت کہے گئے ہیں ان میں بھر پور کرب مذکورہ کیفیات کا نہیں۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے جن سے میرے بیان کی تصدیق ہو جائے گی۔

اس کو مسمار کس طرح کر دوں
گھر بنایا ہے میں نے گھر کی طرح

وہ جو بچھڑا تو دل پہ نام اپنا
لکھ گیا حرفِ معتبر کی طرح

وہ کیا گیا ہے کہ ویران ہو گیا مرا گھر
کیسے بتاؤں کہ جو حال مرے گھر کا ہے

ذکر وفا کا مت چھیڑو!
سب جانے پہچانے ہیں

عمر بھر ساتھ نہ دیتا، مگر اے جانِ جہاں
ایک لمحہ تو مرے ساتھ گزارا ہوتا

جانے میرے شہر کو کس کی نظر نے کھا لیا
رقص کرتی تھی یہاں ہر ہر نفس میں زندگی

غموں کی بھیڑ میں جینا پڑے گا
ہمیں یہ زہر بھی پینا پڑے گا

زخم دل پر مرے اتنے تو نہ تھے
اک عنایت کی نظر سے پہلے

میں تو پھل دار پیڑ تھا کل تک
بے ثمر کر دیا گیا ہے مجھے

کیسا یہ گھر دیا گیا ہے مجھے
در بدر کر دیا گیا ہے مجھے

عجب دستور ہے اس میکدے کا
کوئی سیراب کوئی تشنہ لب ہے

مصرع اولیٰ یا مصرع ثانی یا دونوں ہی مصرعوں میں اگر الفاظ اور فقرے آ جائیں جو ہم وزن ہوں تو شعر میں حسن پیدا کرتے ہیں۔ اگر تمام فقرے پورے طور پر ہم وزن نہ بھی ہوں تو بھی شعر خوبی سے خالی نہیں ہوتے کچھ نہ کچھ حسن تو ظاہر ہوتا ہی ہے۔ قمر جمالی صاحب کے اشعار برائے نام ہیں جن کے مصرعوں میں ہم وزن الفاظ و فقرات موجود ہیں۔ چند مثالیں ۔

ستم شرمندۂ ذوقِ ستم ہوگا تو کیا ہوگا
زمانہ شاملِ اربابِ غم ہوگا تو کیا ہوگا

مجھ کو زخموں کی شکایت ہے نہ شکوہ نہ ملال
رونا اس بات کا ہے اس نے نہ مارا پتھر

میں دل سے پریشان ہوں وہ دل کی طلب سے
لائی ہے وفا رنگ اِدھر اور اُدھر اور

نظر برہم تبسم زیرِ لب ہے
یہ اندازِ تغافل بھی عجب ہے

کوئی مونس نہیں ہمدم نہیں غمخوار نہیں
حالِ دل سارے زمانے کو سنا کر دیکھا

اشعار سے شاعر کی طبیعت اور شخصیت کا بھی کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔
جناب قمر جمالی کو میں نے سنجیدہ طبیعت اور پر وقار پایا ہے۔ اُن میں حق گوئی اور حقیقت پسندی بھی ہے لہٰذا اُن کے شعروں میں بھی غیر حقیقی اور صرف خیالی باتیں بہت کم ہیں۔ وہ اس مزاج کے آدمی نہیں کہ خود پر غیر حقیقی کیفیات کو طاری کر کے اُسے اشعار میں بھی ڈھال دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے تمام کلام میں، شوخی و رندی، ظرافت و مضحک انداز نہیں۔

میں نے اُن کے کلام کو ہر اعتبار سے تنقید کی، کسوٹی پر کسا ہے ان کے کلام میں خوبیوں کی کمی نہیں وہ اپنے ہم عصر شعرا کے کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑے نظر آئے۔ اُن کی شاعری لمحۂ موجود میں گردش کر رہی، وہ حقیقی اور فطری تقاضائے زندگی اور امروز و فردا کی آواز پوری طرح سن رہے ہیں۔ اُن کی شاعری اپنے مزاج اور طبیعت میں حرکی ہے وہ جامد و ساکن نہ خود ہیں نہ اُن کی شاعری۔ اُن کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ ہر حال میں خوب سے خوب تر کی تلاش میں مشکل مرحلوں سے گزرے ہیں۔ عملی آدمی ہیں۔ اُن کے ذاتی اوصاف کا عکس اُن کی شاعری کے اکثر اشعار میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ اُن کی شاعری زندہ، اور متحرک واضح اور بلند حوصلوں کی امین ہے۔

☆☆☆

maablib.org

محسن اعظم ملیح آبادی

قمر جمالی امروہوی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ
حصہ دوم

''اکثر دیکھا گیا ہے، کسی بھی کتاب پر کچھ اہلِ قلم حضرات ایک خاص انداز سے اچھے اشعار چن کر مضمون لکھ دیتے ہیں۔ تقاضائے ادب تو یہ ہے کہ، کلام کے عیوب و محاسن کو سامنے رکھ کر اظہار خیال کیا جائے، تو رہنمائی ہوتی ہے۔''

میں نے جناب قمر جمالی کے شعری مجموعے ''صحرا میں شجر'' کو بالاستیعاب گہری نظر سے پڑھا ہے۔ عروضی و فنی اسقام اور زبان و بیان کی جو فروگزاشتیں سامنے آئیں انہیں قلم بند کر دیا ہے۔ ان کی شاعری کے عمیق مطالعے نے ان کی شاعرانہ خوبیوں کو بھی واضح کیا۔ تنقید کی، کسوٹی انہیں ایک خوش فکر اور صداقت نگار کے روپ میں سامنے لاتی ہے۔ میں نے اپنے طویل مقالے کو دو باب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اوّل ان کی شاعری کے محاسن، اسلوب بیان، زبان اور جدید تقاضائے شاعری کے بارے میں ہے...... باب دوم ان کی شاعری میں موجود معائب و اسقام اور عروضی و فنی بھول چوک کے متعلق وضاحت پر مشتمل ہے...... فنِ نقد و تبصرہ کی کٹھالی میں تپا کر جو کچھ سامنے آیا ہے اُسی کو پیش کیا ہے۔ اپنی ذاتی رائے اور پسند و ناپسند کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے، کیونکہ یہ بات اصولِ نقد نگاری کے خلاف ہے۔

بہت کم ادیب و شاعر ایسے ہیں جو حقیقی تنقید کو برداشت کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے

کہ شعری مجموعوں میں جو مضامین نقد نگاروں کے شامل ہوتے ہیں ۔ ان میں صرف تنقید کا ایک ہی پہلو ملتا ہے ۔یعنی تمدیحی و تعریفی انداز ۔ نقاد ایسے اظہار خیال سے گریز ہی کرتے ہیں جس سے شاعر کے کلام کے معائب سامنے آجائیں ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اکثر شاعر و ادیب بھی چاہتے ہیں کہ ان کی شاعری کی محض خوبیاں بیان کردی جائیں ۔ صحیح تنقید و تبصرہ کیا جائے تو ،شاعر و ادیب خوشی کا اظہار نہیں کرتے ،حالانکہ اصل تنقید سے کسی شاعر کا مقام و مرتبہ کم نہیں ہوتا ۔ دنیا کا کوئی ایسا شاعر و ادیب نہیں جس کے یہاں خوبیوں کے ساتھ معائب و اسقام نہ در آئے ہوں ۔ سہو و نسیان ہر انسان کے ساتھ ہے لہٰذا فروگزاشت کا ہونا لازمۂ بشری میں شامل ہے ۔ قمر جمالی نے خود اس بات پر زور دیا ہے کہ کلام اس طرح دیکھا جائے کہ عیوب و محاسن دونوں کی نشان دہی ہو جائے اور شاعرانہ مقام کا تعین ہو سکے ۔ میں نے ان کے کلام کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کے شعری سقم اور نقائص اور سہو و نسیاں کی بھی نشاندہی کردی ہے ۔ اب قمر جمالی امروہوی میرے اس تنقیدی جائزے سے متفق ہوں یا نہ ہوں یہ خود ان پر منحصر ہے میں نے اس جائزے میں اپنی ذاتی پسند اور رائے کو کہیں بھی جگہ نہیں دی ہے صرف زبان و بیان اور فنی و عروضی ،نقطۂ نگاہ اور موجودہ تقاضوں کے پیش نظر ان کے کلام کو پڑھ کر لکھا ہے ۔ میں نے کتنی عرق ریزی سے ان کی شعری تخلیقات کو دیکھا ہے وہ اپنی شہادت خود ہے ۔ آج کل اس انداز سے تنقید کرنے کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے ۔ جو نقاد خود شاعر بھی ہو اور خدا نے اُسے زبان اور فن کا کچھ علم بھی عطا کیا ہو ۔ اُس کے لیے کسی شاعر کے کلام پر رائے دینا بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ تنقید کی کسوٹی کے ساتھ خود نقاد کا ذوقِ شعری اور ذاتی خیال ، نیز پسند اور ناپسند بھی شامل ہونا چاہتی ہے میں نے حتی المقدور اس سے گریز کیا ہے ۔

کئی سال پہلے جناب صہبا اختر مرحوم نے مجھے اپنے تینوں شعری مجموعے "سرکشیدہ" "سمندر" اور "اقرأ" عنایت کیے اور فرمایا ۔ آپ اسے گہری نظر سے پڑھ کر تنقید فرمائیں اور محاسن و معائب کو بے دریغ بیان کردیں مجھے خوشی ہوگی ۔ میں نے ان کی بارہا خواہش کے مطابق جب ان کے کلام پر اظہار خیال کیا اور ان کی شاعرانہ عظمت و برتری اور محاسن کے ذکر کے ساتھ معائب و اسقام اور زبان و بیان کے اعتبار سے بھی نشان دہی کی ۔ مضمون ایک

سو پچاس صفحات پر مشتمل تھا۔ انہوں نے پڑھا اور خوش ہوئے اور اعتراف کیا کہ جو معائب واسقام آپ نے ۳۶ صفحات پر بیان کیے ہیں ان سے آئندہ احتیاط کرنے کی رہنمائی ملی ہے۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے ان کی شاعری میں لفظیات کا ذخیرہ فراخ ہے، لیکن فنی اعتبار سے، اسقام بھی ہیں۔ جو بہت پر گو شاعر ہوتے ہیں ان سے غلطیاں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ صہبا، جوش ملیح آبادی اور میر انیس کے صحیح مقلد تھے۔ انہوں نے میری تنقید کو فراخدلی سے قبول کیا اور اس کا برملا اظہار اپنے دوستوں میں کیا۔

قمر جمالی امروہوی کے حوالے سے میں نے صرف معائب واسقام کی نشان دہی کی ہے جو واقعی معنوی یا لفظی طور پر قابل گرفت ہیں۔ میں نے ایسی باتیں چھوڑ دی ہیں جو فنی امور میں اب تک متنازعہ ہیں اور دہلوی ولکھنوی دبستانِ شاعری کے مقلدین اور واضعین فن کی بال کی کھال نکالنے والی باتیں ہیں۔ میں جن باتوں سے خود متفق نہیں ان کا اظہار کر دیا ہے۔ دیکھیے قمر جمالی کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے میں نے ان کے اکثر مصرعوں کی وضاحت کے لیے مصرعے بھی دیے ہیں۔ وہ محض صراحت اور مثال کے لیے ہیں۔ ان کا مقصد اصلاح قطعی نہیں ہے اس لیے، کسی شک وشبہ سے بالاتر ہو کر۔ اس مضمون کو پڑھیں۔

حمد

دل میں یارب مرے وہ شمع فروزاں کر دے
جو مری ذات کو خود مجھ میں نمایاں کر دے

شعر کے مصرعۂ ثانی میں حرفِ جار میں کے بجائے دوسرا حرفِ جار پہ استعمال ہونا چاہیے تھا۔ شعر کا واضح اور بلیغ مفہوم حرف "پہ" ہی لانے کا تقاضا کرتا ہے۔ مصرع پر ذرا غور کرنے پر میں اور پہ کا معنوی فرق واضح ہو جائے گا۔

حمد کا یہ مطلع اپنے خاص مفہوم میں پُر معنی ہے، اور دعائیہ انداز میں ہے، شعورِ ذات یعنی عرفانِ حیات کی استدعا کی گئی ہے۔ "دل میں شمع فروزاں کرنے" کا استعارہ روشن ضمیری، بصیرت اور وجدانِ سلیم کی طرف ہے۔ جسے یہ حاصل ہوا۔ عرفانِ حیات اللہ پر یقین کی آخری منزل حق الیقین سے مل جاتی ہے۔ وہ عرفانِ ذات بن جاتا ہے۔ معرفتِ ذات ہی معرفتِ الٰہی ہے، انسان ہر تذبذب وگمان سے نکل کر یقینِ کامل اور نفسِ مطمئنہ کو

پالیتا ہے اور منزلِ راضیہ و مرضیہ پر فائز ہو کر عالم سکر میں چلا جاتا ہے۔
حضور ختمی مرتبت کی ایک حدیث ہے: ترجمہ
''جس نے خود کو پہچان لیا اس نے رب کو پہچان لیا''

وہ مجھے ذات کا عرفان عطا کر یارب
جو بری منزلِ دشوار کو آساں کر دے

اس شعر میں وہ ضمیر مجھے، کے بعد میں لایا جاتا مصرع معنوی اعتبار سے زیادہ پُر زور ہو جاتا، اور تعقیب کا جھول بھی نکل جاتا۔ شعر کا مطلب ہے ''یارب! مجھے ذات کا عرفان عطا کر دے جو بری منزلِ دشوار کو آساں کر دے'' وہ عرفان سے مراد، عرفانِ خاص کا استعارہ ہے اور منزلِ دشوار کا استعارہ عرفانِ ذات حاصل نہ ہونے کی طرف ہے۔ ذرا سی ترمیم کے بعد مصرع ہوگا ۔

ذات کا مجھ کو عرفان عطا کر یارب

یا

مجھے وہ ذات کا عرفان عطا کر یارب

یا

ذات کا وہ مجھے عرفان عطا کر یارب

شاعر نے وہ عرفان بڑا بلیغ جملہ دیا ہے، مگر وہ، عرفان سے دور ہو گیا ہے۔ شاعر نے ''وہ عرفان'' کہہ کر معرفتِ خاص کی دعا مانگی ہے۔ معرفت تو ہر انسان کو حاصل ہے وہ یقین کی پہلی منزل ہے، لیکن شاعر معرفتِ خاص کا طالب ہے جو اُسے حاصل نہیں۔ یہ حمد یہ شعر بطور دعا آیا ہے یہ جگر مرادآبادی کے مندرجہ ذیل مطلع سے زیادہ واضح ہو جائے گا ۔

فیضانِ محبت عام تو ہے عرفانِ محبت عام نہیں
ہر جام برائے بادہ تو ہے ہر بادہ برائے جام نہیں

آئینہ سامنے رکھ کر ترا دیدار کروں
مجھ میں تو اپنی تجلّی کو نمایاں کر !

شعر میں فلسفۂ وحدت الوجود "ہمہ اوست" کی طرف اشارہ ہے۔ ایک گروہ صوفیاء ہر چیز میں ذاتِ باری تعالیٰ کی تجلیوں کا قائل ہے۔ اسی تصور کو شاعر نے مندرجہ بالا شعر میں نظم کیا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ شاعر موصوف اپنے وجود میں تجلی الٰہی کو مجسم دیکھنا چاہتے ہیں اسی لیے آئینے کا ذکر کیا ہے، مگر آئینہ مادّی ہے اس میں تجلی الٰہی جو مطلق لطیف اور غیر مادّی ہے۔ کیسے دکھائی دے گی۔ تجلی کو نمایاں کر دینے کی خواہش سے مراد تو یہ ہوگی جب میں آئینہ دیکھوں تو مجھے اپنی صورت میں میری ذات مجسم نظر آئے اور یہ ممکن نہیں کیونکہ آئینہ انسان کی تخلیق ہے اور انسان کی بنائی ہوئی چیز میں اس کا مجسم ہو جانا، خدا کی قدرت سے زیادہ انسان قادر نظر آئے گا اور یہ شرک ہے۔ خدا کی ذات کو انسان اور اس کی بنائی ہوئی کوئی شے قید نہیں کر سکتی وہ لامحدود ہے اور انسان محدود۔

آئینہ مادّی ہوتا ہے اور مادّی چیز ہی اُس میں منعکس ہوتی ہے لطیف اشیاء کا عکس اس میں نہیں آسکتا۔ تجلی مادّی شے نہیں اس لیے تجلی کتنی ہی نمایاں ہو جائے لطیف رہے گی وہ کوئی شہرہ اختیار نہیں کر سکتی۔ تو پھر آئینے میں کیا دیکھیں گے تجلی کوئی تصویر تو نہیں جو آئینے میں منعکس ہو جائے۔ تجلی نور کا عکس ہوتی ہے۔ نور کا عکس آئینے پر پڑتا ہے تو کوئی تصویر نہیں بنتی۔ مشاہدہ ہے جب آئینے پر روشنی پڑتی ہے تو خیرہ کر دینے والی ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ عالمِ خیرگی میں نظر نہ ٹھہرنے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس لیے دیدار کا لفظ اپنے معنی کھو دیتا ہے۔ دیدار کے لیے کسی تصویر یا چہرے کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے یہ شعر اپنے الفاظ کے ذریعے وہ معنی متبادر نہیں کرتا" ذہن میں نہیں لاتا" جو فی البطن شاعر ہے۔ شاعر ذات الٰہی کا دیدار مادّی آئینے کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں جو نا ممکن ہے، الفاظ شعر مدد نہیں کرتے۔

مادّی آئینے کا ذکر ہے اس میں ذات کے اندر کی تصویر کیسے منعکس ہوگی۔ کیونکہ انسان میں جو، تجلی الٰہی فلسفۂ وحدت الوجود کے مطابق موجود رہتی ہے مادّی آئینہ میں وہ نہیں آئے گی۔ ہاں اگر مادّی آئینے کے بجائے جو اس کو باطنی آئینہ کہا جائے تو اس کا ظاہری آنکھوں کے سامنے ہونا ضروری نہیں۔ کیونکہ بصیرت کا آئینہ بھی غیر مادّی ہوگا اور وہ آئینہ ہوگا ضمیر کا آئینہ یا تصور و خیال کا آئینہ۔

آئینہ اس کے سامنے آیا تو اے قمر
اُس کو بھی اس کے حسن نے حیران کر دیا

یہ فرد "تنہا شعر" حمد کے اشعار کے نیچے لکھا گیا ہے۔ معنوی اعتبار سے حمد کے لیے درست نہیں۔ غزل میں رکھا جاتا تو معنوی اعتبار سے خوبصورت شعر شمار ہوتا۔

خداوند عز وجل اپنی ذات وصفات سے آگاہ ہے۔ تعجب، حیرانی اس کی صفت نہیں۔ یہ انسان کی صفت ہے۔ آئینے میں اپنا حسن دیکھ کر کیسے حیران ہو گیا، کیا وہ اپنے حسن سے پہلے آگاہ نہ تھا۔ اس آئینے نے جو انسان کا بنایا ہوا ہے کیا وہ اس کے حسن کو دکھا سکتا ہے۔ آئینہ دیکھنا اس کی قدرت کی توہین ہے۔ پھر تو آئینہ بنانے والا اور آئینہ خود اس کی قدرت اور ذات کے مقابلے زیادہ صاحب قدرت ہو جائے گا۔ اگر تاویلاً یہ کہا جائے کہ آئینے کا استعارہ انسان اور اس کا حسن مان لیا جائے۔ تو بھی وہ انسانی حسن جو خود اُسی کی تخلیق ہے دیکھ کر کیوں حیران ہو گا۔ خدا کی ذات کے لیے اس قسم کے خیالات شرک میں شامل ہیں۔

بہت سے اساتذہ نے اس قسم کے اشعار کہے ہیں۔ شاعری کے اعتبار سے وہ کتنے ہی درست اور عمدہ سہی مگر معنوی اعتبار سے خصوصاً اللہ کے لیے لانا اُس کی قدرت کی نفی ہے۔ اردو کے مشہور نعت گو امیرؔ مینائی کے ہم عصر، جناب محسنؔ کاکوروی اپنی نظم "سراپائے رسولؐ" میں ایک ایسا شعر لکھتے ہیں۔ جو حسنِ بیان اور شاعرانہ ہنر مندی میں اپنا جواب آپ ہے مگر معنوی طور پر ضرور قابلِ اعتراض ہے۔

ناز سے خامۂ قدرت نے کہا واہ رے میں
بول اُٹھا عارضِ پُر نور کہ اللہ رے میں

اس شعر کا پہلا مصرعہ معنوی اعتبار سے قابلِ گرفت ہے، کیونکہ "خامۂ قدرت" سے مراد ذات باری تعالیٰ کی حیرت میں ڈال دینے والی خوبی ہے۔ وہ اپنی صفتِ صورت گری کو دیکھ کر یعنی تصویر بنی یعنی "چہرہ بنی" بنا کر متحیر ہوا۔ اُس کی قدرت کے منافی ہے۔ کیونکہ وہ حضور ختمی مرتبتؐ کے عارضِ پُر نور سے بھی زیادہ حسین اور انسان کو حیرت واستعجاب میں مبتلا کر دینے والی صورتیں بنانے کی قدرت رکھتا ہے۔ کی قدرت لا محدود

' کو بنانے سے پہلے وہ اُن کے حسن سے واقف تھا جسے تخلیق کر دیا۔ حیرت تو اس چیز پر ہوتی ہے جس کا علم نہ ہو۔ اللہ کی قدرت کا علم لامحدود ہے۔ مندرجہ بالا شعر کا دوسرا مصرعہ بے شک اعلیٰ تر ہے۔ مگر اس میں خانۂ قدرت کے بجائے یہ کہا جاتا۔

''حسن محبوب دو عالم نے کہا اورے میں''

تو شعر، بیان کردہ معنوی اعتراض سے بری ہو جاتا۔ عظیم شاعر محسن کاکوروی کے شعر کی اصلاح مقصود نہیں۔ صرف پہلے مصرعے کے معنوی نقص کو دور کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔

نعت

اگر چاہے! کہ قربت ہو خدا سے
محبت کر، محمد مصطفیٰؐ سے

بے وجہ ضمیر کو حذف کرنا درست نہیں، اگر وزن کی مجبوری حارج نہ ہو تو ضرور لانا چاہیے۔ مصرعۂ اولیٰ میں کاف کا بیانیہ ''کہ'' کی اتنی ضرورت نہیں جتنی ضرورت ضمیر واحد حاضر کی ہے۔ مصرعہ غلط نہیں ہے مگر، ضمیر شعر کو زیادہ واضح کر دیتی، اگر کاف بیانیہ کو رکھنا ہی مقصود تھا تو ذرا سی تبدیلی کر کے یہ کمزوری دور کی جاسکتی تھی مثلاً۔ جو تو چاہے کہ قربت ہو خدا سے'' اگر کی جگہ جو لا کر ضمیر لائی جاسکتی تھی۔ یا شاعر کوئی متبادل مصرعہ لا سکتے تھے۔

میں روز و شب دعائیں مانگتا ہوں
مجھے تو صرف مطلب ہے دعا سے

کوئی عمل بے مقصد و بے سبب نہیں ہوتا۔ عمل کا دارومدار نیت پر ہے۔ حدیث رسول کریمؐ ہے۔ ترجمہ: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے'' دعا اس لیے مانگی جاتی ہے کہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل ہو جائے اور اللہ رب العزت خوش ہو۔ جو کام بے سبب اور غیر شعوری طور پر کیا جائے اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ غیر شعوری طور پر دعا ہو یا کوئی اور عمل وہ دیوانے یا فاتر العقل کا ہوتا ہے۔ یہی وجہ دیوانے کے کسی عمل کی سزا یا جزا اور پرستش نہیں ہے۔ دراصل شاعر کا خیال واضح نہیں جو وہ کہنا چاہتے تھے وہ فی البطن ہے۔ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ: ''میں دن رات دعائیں مانگ رہا ہوں مجھے صرف دعاؤں سے کام ہے۔ خواہ اللہ، دعاؤں کو پوری کرے یا نہ کرے۔ وہ مالک و مختار ہے۔ میں خوشنودی رب کے لیے دعائیں مانگتا ہوں'' مگر

ان کے الفاظ سے یہ مفہوم ظاہر نہیں ہے۔ پس بے مقصد اور بغیر نیت کے کوئی دعا بھی بے اثر ہے۔

جب بھی ہم آپؐ کے قدموں کے نشاں تک پہنچے
اک نئے نکتۂ مقصودِ جہاں تک پہنچے

شعر کے مصرعۂ ثانی میں صرف لفظ مقصود سے حقیقی مفہوم تک نہیں پہنچ سکتے مفہوم تشنہ رہتا ہے اور ذہن کسی تشریحی لفظ کی کمی محسوس کرتا ہے۔ لفظ مقصود کے حقیقی معنی قافیے جہاں کے ساتھ معنوی طور پر معاون نہیں۔ اصل مفہوم فی البطن شاعر ہے اس کے لے جو لفظ مقصود لائے ہیں وہ ان کے مضمون کو ظاہر نہیں کرتا۔ مصرعہ یوں ہونا چاہیے تھا۔

اک نئے نکتۂ تخلیقِ جہاں تک پہنچے

لفظ مقصود کے بجائے تخلیقِ جہاں کے استعمال سے معنوی سقم دور ہو سکتا تھا۔ غالباً جو خیال شاعر کا ہے وہ اگر ذیل کے مضمون کے مطابق ہے تو لفظ مقصود نہایت تشنہ اور کمزور ہے۔

جب ہم آپ ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' کی رہنمائی میں اُن کی عظمت و شان کی انتہا تک پہنچے تو ہمیں اس راز سے آگاہی ہوئی کہ آپؐ ہی باعثِ تخلیقِ جہاں ہیں۔ آپؐ ہی کی ذات منزلِ عظمتِ انتہائی ہے۔

اس شعر کا مصرعۂ ثانی جو مطلب فراہم کرتا ہے وہ یہ ہے۔

ہم جب بھی حضور کے قدموں کے نشاں ''یعنی اسوۂ رسولؐ'' تک پہنچے تو غرض جہاں کے ایک نئے راز تک رسائی ہوئی، کہ یہ کیوں تخلیق ہوا ہے۔

مقصودِ جہاں کا ترجمہ ہوگا:

غرض جہاں، مرادِ جہاں، مطلب جہاں، باعثِ جہاں مندرجہ بالا سطر میں دیے گئے، جملے تشنہ ہیں۔ صحیح جملہ اس طرح بنے گا۔ باعثِ تخلیقِ جہاں، غرض تخلیقِ جہاں، مراد تخلیقِ جہاں، مطلب تخلیقِ جہاں۔ صرف مقصودِ جہاں کہہ کر مفہوم کو واضح نہیں کیا جا سکتا۔ مفہوم تشنہ رہے گا۔ اسے سست بندش کہتے ہیں۔ جہاں خود فاعل حقیقی نہیں ہے بلکہ مفعول ہے اور فاعل حقیقی کے تابع ہے۔ فاعل حقیقی صرف رب العالمین جس نے دنیا کو حضورؐ کے

باعث تخلیق کیا۔ مقصود جہاں کے ترجمے کو دیکھتے ہوئے یعنی غرض جہاں سے مفہوم واضح نہیں۔ پہنچتا تو وجہ تخلیقِ جہاں تک ہے۔

اگر ہم کہیں مقصودِ تخلیقِ جہاں کیا ہے مقصودِ تخلیقِ انسان کیا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں۔ دنیا کو بنانے کا کیا مطلب ہے۔ انسان کو بنانے کا کیا سبب ہے۔

مقصودِ جہاں سے سطر بالا میں دیئے ہوئے مفہوم کو متبادر نہیں کیا جا سکتا۔

اگر مصرعہ پر غور کیا جائے تو مقصود کی تشریح کے ایک لفظ کی ضرورت محسوس ہوگی وہ خواہ تخلیق کا لفظ ہو یا تشکیل کا لفظ ہو یا ان کے مترادف الفاظ۔

شاعر محولہ بالا شعر میں ایک حدیث قدسی کا مفہوم لانا چاہتے ہیں حدیث ہے۔

ترجمہ:

تم "اے محمدؐ" نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو نہ پیدا کرتا۔

اس میں کوئی شک نہیں محبوبِ رب باعثِ تخلیقِ عالم آپؐ ہیں

☆☆☆

maablib.org

حصہ غزلیات...... ناموزوں مصرعے

یہاں تو نفسا نفسی کا سا عالم ہے اس عالم میں
کسی کا، کون ہو جائے کسی کو، کون اپنائے

مندرجہ بالا شعر کے مصرعۂ اولیٰ کے رکن عروض میں لفظ عالم کا عین ساقط ہو گیا ہے اس لیے ناموزوں شمار ہو گا۔

اس عالم کو اس بالم پڑھیے تو "ب" وزن میں نہیں آئے گا دراصل اس کے بعد عین گر، اِسا بن گیا ہے۔

اس دور پُر آشوب میں ارباب سیاست
حالات کچھ ہوتے ہیں لگاتے ہیں خبر اور

محولہ بالا شعر کے مصرعۂ ثانی کا رکن دوم جسے ارکان بحور میں "حشو" کا نام دیا گیا ہے۔ کچھ کے بعد ہو گا "ہ" ساقط ہو کر کچھو، بن گیا ہے جس نے مصرعہ ناموزوں کر دیا۔ اس کو یوں سمجھئے کہ اگر کچھ بولتے کہا جائے تو "ب" وزن میں نہیں آئے گا۔ یعنی مصرعہ مذکورہ اس طرح ہو جائے گا۔

حالات کچھوتے ہیں لگاتے ہیں خبر اور

سر پہ پتھر نہ برستے یارو! ...... ناموزوں
کاش! رستہ بدل لیا ہوتا ...... درست

اس شعر کا مصرعۂ اولیٰ کا رکن دوم یعنی "حشو" بدل گیا ہے یعنی، مفاعلن کے

بجائے فعلاتن ہوگیا ہے۔ دراصل تلفظ برستے تھا جو نہ برستے ہو جانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ جس سے مصرعہ ناموزوں ہوگیا ہے۔

پہلے مصرع کا وزن...... فاعلاتن، فعلاتن، فعلن

دوسرے مصرعے کا وزن: فاعلاتن، مفاعلن، فعلن ۔ اصل وزن پوری غزل کا یہی ہے۔

آئینہ دیکھوں تو یہ عقدہ کھلے ...... ۳ رکنی مصرعہ

وہ سراپا نور ہے یا میں سراپا نور ہوں...... ۴ رکنی مصرعہ

مصرعۂ اوّل کا وزن...... فاعلاتن، فاعلاتن فاعلن "بحرِ رمل محذوف مسدس"

دوسرے مصرعے کا وزن...... فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن "بحرِ رمل محذوف مثمن" ایک رکن بڑھ گیا ہے۔

لفظ" حسرت" کا استعمال

لفظ" حسرت"، "حسرا"، "حسرۃ" ۔ اس کے حقیقی معنیٰ ، افسوس کرنا، دریغ، پشیمانی۔ یعنی کسی امید، خواہش اور آرزو کے پورا نہ ہونے کا غم، یا افسوس، ندامت کے مفہوم میں آتا ہے مثلاً۔

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

❖❖❖

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد
گر نہیں وصل ، تو حسرت ہی سہی

غالب

اس لفظ کے اصلی اور لغوی معنیٰ تو یہی ہیں اور مستند شعرا نے اکثر اسی مفہوم میں لکھا ہے، مگر کچھ فارسی شعرا نے حسرت کے معنیٰ ارمان، آرزو، امید، تمنا کے بھی اصطلاحاً لکھے ہیں۔ فارسی شعرا کے تتبع میں کچھ اردو شعرا نے بھی اس لفظ کو ارمان اور آرزو کے مفہوم میں نظم کیا ہے جو غلط ہے۔ اسی روایت کے پیش نظر قمر جمالی نے اکثر اشعار میں لفظ" حسرت" کو امید، آرزو اور ارمان کے مفہوم میں لکھا ہے۔ جس سے اتفاق کی گنجائش نہیں مثلاً۔

کوئی بھی بس نہ چل سکا دیکھتے رہ گئے قمر
بہہ گئیں ساری حسرتیں سیلِ بلا کے شور میں

❖❖

ترے دیدار کی حسرت ہے دل میں
فقط تیری زیارت چاہتا ہوں

اس کے مصرعۂ آخر میں لفظ "زیارت" بھی کمزور مفہوم میں نظم ہوا ہے۔ جو رویت، طلعت، یا قریب المعنیٰ لفظ نظارہ کے مفہوم میں آیا ہے۔ زیارت کے معنیٰ اگرچہ کسی بزرگ سے ملاقات کرنے کے بھی ہیں لیکن اردو میں اس کا اصطلاحی مفہوم، کسی بزرگ کا روضہ یا مزار دیکھنے کے معنیٰ میں آتا ہے۔ جس طرح دیدار، رویت، یا طلعت زندہ آدمی کو دیکھنے کے مفہوم میں ہے اسی طرح زیارت کسی مردہ شخص کے مزار کے نظارہ کرنے کے لیے بولا جاتا۔ مثلاً زیارتِ کعبہ، زیارت روضۂ اقدس، اسی لفظ زیارت سے زائر، زوّار ہیں۔ زندہ انسان سے ملاقات کے معنیٰ میں لفظ زیارت کو اردو میں نہیں بولتے۔ اور جو بولتے ہیں وہ روزمرہ محاورے کے خلاف ہیں۔

دل کو حسرت ہے زندگی میں کوئی
میرے زخموں کو بھی شمار کرے

❖❖

روبرو اُن کے، اُن کی محفل میں
رہ گئیں دل کی حسرتیں دل میں

رہ گئی دل کی آرزو دل میں، اس طرح مصرعے کے دو لفظ بدل دینے سے یہ سقم دور ہو سکتا تھا۔

لفظ حسرت کا استعمال

وہ شے ناپید ہے دنیا میں شاید
زمانہ جس کی حسرت کر رہا ہے

❖❖

چاہے انجامِ دیدار کچھ بھی سہی
حسرتِ دید تو معتبر ہو گئی

❖❖

ہمیشہ یہی ایک حسرت رہی ہے
کبھی تو ہمیں زندگی راس آئے

❖❖

رقص کریں گی حسرتیں جھوم اُٹھے گی زندگی
نغمہ سرا تو ہو کوئی سازِ وفا کے شور میں

حسرت کا استعمال ہر شعر میں، امید و آرزو کے مفہوم میں ہے۔

ذم اور مبتذل جملے

مصرعے میں کوئی ایسا لفظ یا جملہ لانا، جس سے تصور میں کوئی رکیک یا مبتذل خیال آجائے، اُسے ذم کہتے ہیں۔ یہ فصاحت کے بھی خلاف ہے، اور عجزِ بیان میں شامل ہے۔ تقدیم وتاخیر الفاظ سے اگر ذم کا پہلو نکل سکے تو ضرور نکال دینا چاہیے۔ مندرجہ ذیل اشعار کے مصرعوں میں، رکیک، مبتذل جملے آگئے ہیں جن سے ذم کا پہلو اُبھرتا ہے۔

کیوں نہیں کرتے ہیں دونوں مل کے دشمن کی تلاش
بھائی سے یہ بھائی لڑکر یوں ہی مرجائیں گے کیا

ذرا سی تقدیم وتاخیر سے ذم کا پہلو نکل سکتا تھا۔ مثلاً!۔

دونوں مل کر کیوں تلاشِ دشمناں کرتے نہیں

❖❖

کب تلک کرتے رہو گے تم، سحر کا انتظار
تیرہ بختو! یہ اندھیرے نور برسائیں گے کیا

ذرا سی تبدیلی سے ذم دور ہو سکتا تھا۔

انتظارِ صبح تم کرتے رہو گے کب تلک ...... یا یہ کے
گم رہو گے انتظارِ صبح میں تم کب تلک

خود سحر بن جاؤ آخر کیوں سحر کا انتظار
کوئی لطفِ شبِ غم اس سے پوچھئے
کرے جو رات بھر اختر شماری

''کرے جو رات بھر'' اس جملے سے سخافتِ خیال اور مبتذل تصور اُبھرتا ہے۔

کہ جس کا شغل ہو اختر شماری

''رات بھر کہنا'' بے ضرورت ہے، اختر شماری کا عمل رات ہی کو ہوتا ہے۔ اختر شماری میں رات کا تصور موجود ہے۔ رات ''حشو'' میں شامل ہے۔

محولہ بالا شعر کے مصرعۂ ثانی میں، جملہ آؤ ہم بڑھ کر لگا دیں، سے ذم کا پہلو بھی اُبھرتا ہے۔ اس لیے ذرا سی تبدیلی سے ذم کو نکالا جا سکتا تھا۔ یعنی۔

آیئے ہم مل کے بھر دیں اُس کے مستقبل میں آگ

◆◆

آؤ بھر دیتے ہیں، ہم بھی اُس کے مستقبل میں آگ
آؤ بھر دیتے ہیں اُس کے حال و مستقبل میں آگ

◆◆

تم بہر صورت قمرؔ ذوقِ نظر سے کام لو!
خود لگا دے گا، نظارہ پردۂ حائل میں آگ

''خود لگا دے گا'' یہ جملہ پہلوئے ذم رکھتا ہے۔ اگر نظارہ کا لفظ فعل ''خود لگا دے گا'' سے پہلے آتا تو پھر ذم کا پہلو نہ ہوتا۔

خود نظارہ پھونک دے گا پردۂ حائل میں آگ...... پھیلا دینا

کب تلک کرتے رہو گے، احترامِ راہبر
راہبر نے خود لگا رکھی ہے ہر منزل میں آگ

''کب تلک کرتے رہو گے'' اس جملے سے ذم اور مبتذل خیال اُبھرتا ہے۔ اس جملے کے بجائے: ذرا سی ترمیم سے ذم کا پہلو نکل سکتا تھا یعنی۔

احترامِ راہبر کرتے رہو گے کب تلک...... یا یہ کے

دیتی نہیں یہ دنیا کیوں اس کو سزا کوئی
دن رات جو دیتا ہے، فتنوں کو ہوا کوئی

''فتنوں کو دیتا ہے'' کہہ کر ذم کا پہلو دور کیا جا سکتا تھا ۔

کر بیٹھو محبت میں جب جرمِ وفا کوئی
ہوتا ہے، تو ہونے دو پھر تم سے خفا کوئی

کر بیٹھو کی جگہ'' ہو جائے محبت میں جب جرمِ وفا کوئی'' کہہ کر ذم دور کیا جا سکتا تھا۔دوسری بات یہ ہے کہ اس غزل کے قوافی میں'' ف'' حرف قید نہیں جبکہ مطلع میں خفا اور وفا، دونوں میں'' ف'' بطور حرف قید کے آیا ہے۔حالانکہ یہ مطلع ثانی ہے، مگر، ایسا نہیں ہونا چاہیے ۔

بے ساختہ مرنے کو جی چاہنے لگتا ہے
جب بھی ہمیں دیتا ہے جینے کی دعا کوئی

''جب ہمیں دیتا'' اس جملے سے ذم کا پہلو نکلتا ہے یہ ذرا سی تبدیلی سے دور ہو سکتا تھا۔یعنی ۔

جب بھی ہمیں جینے کی دیتا ہے دعا کوئی

یا

جب بھی مرے جینے کی کرتا ہے دعا کوئی

❖❖

کوئی سمجھے تو، محبت کی زباں ہے یہ بھی
آج بھی کرتا ہے لوگوں کو اشارہ پتھر

جملہ'' آج بھی کرتا ہے'' سے ذم اور رکیک خیال متبادر ہوتا ہے۔تعقیب بھی ہے۔ذرا سی ترمیم سے تعقیب اور ذم کا سقم دور ہو سکتا تھا، یعنی ۔

آج بھی اہل نظر کو ہے اشارہ پتھر

❖❖

اُٹھ گیا بزمِ ہستی سے بیمارِ غم
وہ دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتے رہے

''اُٹھ گیا'' سے متبذل خیال اُبھرتا ہے۔ تعقیب بھی ہے۔ تاخیر و تقدیم سے یہ سقم دور ہو سکتا ہے۔ مثلاً ۔

بزمِ ہستی سے بیمارِ غم اُٹھ گیا

ناخداؤں سے یہ طوفان سمیٹا نہ گیا
ورنہ طوفان سمٹتا تو کنارہ ہوتا

مندرجہ بالا شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں حرف اشارہ قریب ہے وہ ''حشو'' میں شامل ہے۔ اس کے استعمال سے سوال اُبھرتا ہے کون سا طوفان ۔ یہ کی جگہ بھی کا استعمال زیادہ مناسب بھی سے ناخداؤں کا اختصاص متبادر ہوگا ۔

جس نے اس دنیا کا مستقبل جلا کر رکھ دیا
آؤ ہم بڑھ کر لگا دیں اُس کے مستقبل میں آگ

لگنا، لگ پڑنا، لگا دینا، لگے لگے، لگ لگ کے، لگالیں، یہ تمام افعال اگر درست طریقے سے استعمال نہ ہوں تو معنی رکیک اور متبذل خیال اُبھرتا ہے...... آؤ ہم بڑھ کر لگا دیں، متبذل اور ذم کا پہلو رکھتا ہے ردیف کی گرفت بھی حرف جار ''میں'' کی وجہ سے کمزور پڑ گئی ہے۔ حرف جار ''میں'' کے بجائے ''کو'' علامت مفعول کا محل ہے روز مرہ محاورہ اور اصول قواعد کے اعتبار سے بھی ''کو'' ہی ضروری ہے۔ میں کا استعمال خلافِ روز مرہ ہے۔

کون اس عہدِ نفسا نفسی میں
مذہبِ عشق اختیار کرے

ا...... مندرجہ بالا شعر کے مصرعۂ اولیٰ سے، سوال اُبھرتا ہے، عہد نفسا نفسی میں کیا مذہب نہیں اختیار کیا جا سکتا۔ مذہب عشق اختیار کرنے کے لیے عہد غیر نفسا نفسی ہونا لازمی ہے۔ جبکہ عشق کا جذبہ غیر اختیاری ہے۔ عشق سوچ سمجھ کر کبھی نہیں کرتے عشق تو ہو جاتا ہے۔ خود شاعر موصوف بھی اس کے قائل ہیں۔ کیا ہی عمدہ سلیس شعر کہا ہے۔ اس غزل کے تمام شعر ہی عمدہ ہیں ۔

کیسے ممکن ہے بھول جاؤں انہیں
کیا محبت بھی اختیاری

۲......اس شعر کا مصرعۂ ثانی ردیف کے علاوہ میر کے مصرعے سے توارد ہو گیا ہے......اگر معلوم ہو تو مصرع بدل دینا چاہیے۔

سخت کافر تھا جس سے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

❖❖❖

اُسی کا نام تو یارو! قمر ہے
بچا رکھا ہے جس نے تیرگی سے

قمرات کی تیرگی کے لئے ایک چراغ ہے۔ جو تابع ہے سورج کے، تیرگی سے بچانے والا تو سورج ہے۔ جس سے قمر خود روشن ہے اگر سورج نہ ہو تو قمر بے معنی ہے، معنوی اور علمی سقم ہے۔

وضاحت کے لیے ضروری تھا کہ، شب کی تیرگی، یا تیرہ شبی سے یا جو بھی پُر معنی لفظ وزن میں آتا لیکن شب کا حوالہ ضروری تھا، قمر کی روشنی سے فیضیاب ہونے کے لیے۔ دن میں اپنے مقام پر ہوتے ہوئے سورج کی تیز روشنی میں نظر نہیں آتا۔ اگر یہ اس طرح ہوتا!۔

اُسی کا نام تو یارو ! قمر ہے
بچاتا ہے جو شب کو تیرگی سے

جب مکمل سورج گرہن ہوتا ہے تو چاند موجود ہوتے ہوئے بھی دن جیسی روشنی کہاں ہوتی ہے ہر لفظ کا منظر اور پس منظر پیش نظر رکھ کر استعمال کرنا لفظ کا صحیح استعمال ہے۔ مطلق تیرگی کے لفظ سے جو مفہوم متبادر ہوتا ہے۔ وہ قمر کی روشنی سے باہر ہے۔

وقت آ کر کبھی نہیں ٹھہرا
وقت کا، کون انتظار کرے

اگر کسی کے آنے کا وقت مقرر ہو تو اس کا انتظار ہوتا ہے۔ یا کوئی آئے اور دوبارہ آنے کا وقت مقرر کر دے یا وقت کا تعین نہ بھی کرے تو بھی انتظار ہوتا ہے بس غیر معین وقت کے انتظار میں بے قراری نہیں ہوتی۔ ایسے شخص کا انتظار کبھی نہیں کیا جاتا جس کے متعلق

معلوم ہو کہ وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔

دراصل جس خیال کو شاعر نظم کرنا چاہتے تھے، وہ نظم نہیں ہو سکا ہے۔ وہ کہنا یہ چاہتے تھے۔ ''جو وقت ایک مرتبہ آ کر چلا جاتا ہے پھر واپس نہیں آتا، پھر ایسے وقت کا انتظار کیوں کیا جائے۔'' اگر شاعر موصوف فرماتے ۔

وقت جا کر کبھی نہیں لوٹا

یا

وقت جا کر کبھی نہیں آتا

وقت واپس کبھی نہیں لوٹا

تو انتظار کا استعمال برمحل ہو جاتا۔ لفظ ٹھہرا، نے مفہوم کو کمزور کر دیا ہے۔ کیا وقت آ کر، ٹھہرے جبھی اُس کا انتظار کیا جائے، اگر کسی کے آنے کا علم ہو، تو اس کا انتظار ہو گا، لیکن آ کر ٹھہرنا شرط انتظار نہیں۔ مگر مصرعہ میں شرط ہے کہ جب وقت ٹھہرتا نہیں تو کیوں انتظار دیکھا جائے۔ یہ معنوی سقم بغور پڑھنے سے متبادر ہوتا ہے کسی قدیم شاعر کا شعر ہے ۔

گیا وقت ، پھر ہاتھ آتا نہیں

سدا دور ، دور، دور دکھتا نہیں

جس سے زندہ ہے محبت کا شعور

عشق کا میں ہی تو وہ دستور ہوں

عشق اور محبت الگ چیز نہیں، شدت محبت یعنی انتہائے محبت کا نام عشق ہے محبت کا شعور کے بجائے کوئی دوسرا پُر معنی مرکب لایا جاتا تو عشق کی اہمیت واضح ہوتی۔ ''معرفت کا جس سے زندہ ہے شعور'' کہہ کر عشق کی عظمت نمایاں کی جا سکتی تھی، عشق محبت کا دستور کیوں ہو گا محبت اور عشق دونوں ہی دستور ہیں دونوں ہی ایک زمرے میں شامل ہیں صرف ڈگری کا فرق ہے معرفت کے علاوہ بھی کوئی مناسب پُر معنی لفظ لایا جا سکتا ہے ۔

جو دامن چاک کر ڈالا ہے تم نے

تمہیں اک گا

مندرجہ بالا شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں حرف ''جو'' حرفِ شرط سے زیادہ حرفِ موصول کے معنیٰ دے رہا ہے۔ اس لیے مصرعۂ ثانی میں حرفِ اشارۂ قریب ''یہ'' کی جگہ حرفِ جوابِ موصول ''وہ'' لانا زیادہ برمحل تھا۔ حرفِ شرط کے ساتھ تو ''یہ'' کا استعمال درست ہوتا، مگر مصرعۂ اولیٰ کے شروع میں حرفِ شرط ''جو'' معنوی اعتبار سے کمزور معنیٰ دے رہا ہے۔ پس ''جو'' حرفِ موصول کے مقابلے میں جوابِ موصول ''وہ'' ہی درست ہے۔

تعصب کو ہوا دو گے، تو یارو!
دلوں میں اور بھی کینہ پڑے گا

محولہ بالا شعر کے مصرعۂ ثانی میں لفظ ''اور'' سے مزید کے معنیٰ متبادر ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کینہ دلوں میں پہلے ہی سے پڑا ہوا تھا (موجود تھا) تعصب کی ہوا سے بڑھ جائے۔ کوئی بیماری یا بُرائی، پہلے اپنا گھر بناتی ہے۔ پھر حالات نامناسب ہوں تو اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے اور کینہ پڑے گا کے جملے کے مقابلے ''اور کینہ بڑھے گا'' کا محل استعمال تھا مگر ردیف کی مجبوری نے معنوی سقم پیدا کر دیا ہے۔ بہر حال ''کینہ اور پڑے گا'' کمزور بندش ہے۔

دنیا یہ سمجھ لے کہ مرا نام قمر ہے
میں شب کو اندھیرے میں بھی بیدار، رہوں گا

مصرعۂ ثانی میں شب کے ساتھ مفعول 'کو' کی ضرورت نہیں۔ سست بندش ہے اور 'کو' کا استعمال یہاں غلط ہے۔ ''شب کو'' کی جگہ 'شب کے' لکھنا صحیح استعمال تھا۔ شب اور اندھیرا، ہم معنیٰ الفاظ ہیں۔ شاعر کہنا چاہتے ہیں رات کو زیادہ تاریکی میں بھی روشنی دیتا رہوں گا، مگر شب کے بعد اندھیرے کا لفظ شب کی زیادہ تیرگی کو ظاہر نہیں کرتا۔ ''شب کو اندھیرے میں'' جملہ درست نہیں۔ شب اندھیرے ہی کو کہتے ہیں فرق صرف فارسی اور اردو کا ہے۔ اردو شعرا نے جہاں، کالی رات، سیاہ رات، اندھی رات، تاریک رات، گھور اندھیرا یا فارسی مرکبات، شبِ سیاہ، شبِ تیرہ، شبِ تاریک، شبِ اعمیٰ، اور شبِ یلدا، شبِ دیجور وغیرہ، جیسے مرکبات کو شب، شب کی زیادہ تاریکی کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیے ہیں۔ اس لیے شب یا رات سورج غروب ہو جانے کے بعد جو اندھیرا چھا جاتا اس کا نام ہے۔ اس

لیے شب کو اندھیرا، یا شب کا اندھیرا، معنوی اعتبار سے کمزور ترین زبان ہے۔ شاعر جو ایک جگہ فرماتے ہیں!۔

کون کہتا ہے کہ تھک کر چور ہوں
فخر ہے میرا، کہ میں مزدور ہیں

شعر کے مصرعۂ ثانی کا جملۂ اول، فخر ہے میرا کے بجائے فخر ہے مجھ کو یا فخر ہے مجھے، صحیح محل استعمال ہوگا، اگر قافیہ مزدوری ہوتا تو پھر فخر ہے میرا، صحیح استعمال سمجھا جاتا۔ بول چال میں اس طرح کبھی نہیں بولتے کہ میرا فخر یہ ہے، کہ میں مزدور ہوں، بلکہ صحیح جملہ ہوگا!۔

فخر ہے مجھ کو، کہ میں مزدور ہوں

وہ جو، بچھڑا تو دل پہ نام اپنا
لکھ گیا حرفِ معتبر کی طرح

شعر اچھا ہے لیکن مصرعۂ اولیٰ کے شروع میں وہ جو کا اکھٹا استعمال مصرعہ کی روانی میں ثقالت پیدا کر رہا ہے۔ غلط نہیں ہے مگر "وہ جو" ایک ساتھ ہیں اس لیے اچھا نہیں لگتا۔ جب وہ بچھڑا، کہنا زیادہ فصیح تھا۔

تو ہی بتلا کبھی عمل کے سوا
کس نے چاہا تجھے قمر کی طرح

مصرعۂ اولیٰ میں ہاتھ سے، کبھی عمل لکھا گیا ہے۔ عمل کے بجائے قمر ہی درست ہے یعنی "تو ہی بتلا کبھی قمر کے سوا"۔ بتلا بھی متروک ہے۔

رسن و دار کی محفل میں یہ کیوں رونق ہے
حرفِ حق منہ سے کسی نے تو نکالا ہوگا

رسن و دار کی محفل نہیں ہوتی منزل ہوتی ہے۔ معنوی سقم ہے جو بظاہر نظر نہیں آتا، مگر نقص میں شمار ہوگا۔ احتیاط لازم ہے۔ رسن و دار کو مقامِ سزا تصور کیا جاتا ہے۔

ایسی ذہنوں میں کثافت کبھی پہلے تو نہ تھی
آدمی آج یہ کس دشتِ خطرناک میں ہے

ضیاءالحق قاسمی کلام سناتے ہوئے اور مہمان خصوصی قمر جمالی محوِ سماعت

مظفر حنفی، قمر جمالی اور سحر انصاری

تقریب اعتراف کمال میں قمر جمالی، حسنین کاظمی، سید قمر رضی، ساجد میر اور رؤف صدیقی صاحب

اعتراف کمال کی تقریب میں مسرور جاوید قمر جمالی کے فن پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے

قمر جمالی، افضل منگلوری

بموقع ضیافت گالف کلب کراچی شہر قائد کے مشاعرے میں مدعو شعراء کے ساتھ

قمر جمالی، احمد شاہ اور دیگر آرٹس کونسل کی تقریب میں

آرٹس کونسل کی ایک تقریب میں قمر جمالی، فرہاد زیدی اور سیف الرحمٰن گرامی کے ساتھ

مصرعۂ اولیٰ میں تعقیب ہے ذرا سے ردو بدل سے تعقیب جو تعقید میں بدل گئی ہے درست ہو سکتی تھی ۔

۴ ۲ ۵ ۱ ۶ ۳
ایسی ذہنوں میں کثافت کبھی پہلے تو نہ تھی
۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶
کبھی ذہنوں میں نہ تھی ایسی کثافت پہلے

ایسی کثافت سے دور ہے اس لیے تعقیب ہے ۔

اپنا ادراک قمر کس کو میسّر ہے یہاں
ابھی ہر شخص یہاں جادۂ ادراک میں ہے

ادراک کے بجائے ، یہاں عرفان زیادہ موزوں لفظ تھا ، ادراک کا عمل پورا ہونے کے بعد عرفان کی منزل آتی ہے وہ ابھی میسّر نہیں اس لیے عمل ادراک جاری ہے۔ ادراک کا حاصل اور مقصود عرفان ومعرفت ہے۔ ادراک کی تکرار سے مفہوم میں سقم آ گیا ہے۔ یا پھر ادراک کی منزل لکھنا چاہیے تھا ، تاکہ مفہوم فصیح ہو جاتا۔ صرف ادراک کے استعمال سے شعر کی معنوی خوبصورتی کم ہو گئی ہے ۔

جس کو انسان کی معراج کہا جاتا ہے
وہ بلندی بھی کہیں قسمتِ افلاک میں ہے

انسان کی معراج ، عرفان وعظمتِ انسانی کا شعور ہے جو ذی روح کے لیے ہے افلاک کا انسان سے کیا مقابلہ اس کی بلندی اور وسعت اور چیز ہے اور انسان کا عروج قربِ الٰہی کی نسبت سے ہے۔ افلاک کی بلندی قد سے تعبیر کی جاتی ہے انسان کی بلندی ومعراج ذات کے عرفان کے تعلق سے ہے۔ افلاک کی مخلوق ، یعنی فرشتوں سے مثال دی جاتی ہے تو درست یعنی ایسی رفعت بھلا کس افلاک میں ہے ۔

کب تلک کرتے رہو گے تم سحر کا انتظار
تیرہ بختو! یہ اندھیرے نور برسائیں گے کیا

شاعر ، کا مطلب ہے: سحر کا انتظار تم کب تک کرتے رہو گے سحر معلوم نہیں کب آئے گی ، بد

قسمتوں! اندھیرے تو، نور برسانے سے رہے، تم خود کیوں سحر نہیں بن جاتے ۔ اگر شاعر کا اصل مفہوم یہی ہے تو دونوں مصرعے پوری طرح اس مفہوم کو واضح نہیں کرتے ۔ مصرعہ بدلنا تھا ۔ یعنی خود سحر بن جاؤ، آخر کیوں اس کا انتظار ہے ۔

۱ ۲
دل سے مجبور تھے ہم خدا کی قسم
نازِ بے جا بھی اُن کے اُٹھاتے رہے

مصرعہ میں تعقیب ہے ۔ جہاں تک ممکن ہو ضمیر پہلے آنا چاہیے، ہاں بحر کی مجبوری ہو تو خیر ۔ "ہم خدا کی قسم دل سے مجبور تھے" کہہ کر تعقیب کا نقص نکال سکتے تھے ۔

۲ ۱ ۳
اُٹھ گیا بزمِ ہستی سے ، بیمارِ غم
وہ دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتے رہے

مصرعے کے شروع میں فعل نہیں لانا چاہیے ، اگر وزن یا کوئی دوسری شعری مجبوری حارج نہ ہو، تو تقدیم و تاخیر سے تعقیب کا نقص دور کیا جا سکتا تھا یعنی ۔ "بزمِ ہستی سے بیمارِ غم اُٹھ گیا" ۔

سن کے پیغامِ بہاراں مسکرا تو لیں مگر
مسکرانے سے ہمارے پھول کھل جائیں گے کیا

اس شعر کے مصرعہ ثانی میں پھول کی جگہ "غنچے" ہوتا تو زیادہ پُر معنی ہوتا، پھول تو کھلے ہوئے غنچے کو کہتے ہیں اگر مجبوری ہو تو مضائقہ نہیں مگر احتیاط لازم ہے ۔ پھول کھلنے سے مراد شادی ہونا بھی محاورہ ہے مصرعہ یوں ہو سکتا تھا! غنچۂ دل مسکرا لینے سے کھل جائیں گے کیا ۔

جہاں کل تک محبت جاگتی تھی
اُنھی آنکھوں میں اب غیظ و غضب ہے

مصرعہ ثانی میں "اُنھی آنکھوں" آیا ہے پہلے مصرعہ میں، جس میں لانا تھا ۔ جہاں سے محل ہے ۔ جہاں سے مطلب اُلجھ گیا ہے ۔ اس سقم کو ذرا سے تغیر سے دور کر سکتے تھے مثلاً

جن آنکھوں میں محبت جاگتی تھی......

یا

محبت جاگتی تھی جن میں کل تک
اُنہی آنکھوں میں اب غیظ وغضب ہے
انہیں پل بھر میں مرجھانا پڑے گا
میں ڈرتا ہوں گلوں کی تازگی سے

خوف، تو گلوں کی شگفتگی سے آتا ہے، کیونکہ پھولوں کے کھلتے ہی اُن کے مرجھانے کا تصور اُبھرتا ہے۔ تازگی سے خوف آنا، بے محل ہے، جب پھول کھلیں گے تو ان میں نزہت وتازگی تو موجود ہوگی۔ دراصل گل کی شگفتگی وجہِ افسردگی بن جاتی ہے۔ حیات موت پر ختم ہوتی ہے۔ اور حیات کی تمام رونقیں اور خوشیاں بھی موت کی نذر ہو جاتی ہیں۔ شاعر قافیے سے مجبور تھے شگفتگی وزن میں نہیں آتا اس لیے تازگی لکھ دیا۔ جس نے معنوی جھول پیدا کر دیا۔ گل جو کھلنے سے پہلے کلی ہوتا ہے اس میں بھی تازگی موجود ہوتی، کلی کا کھلنا اس کی جوانی ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے، جو کلیاں مسموم ہوا میں آجاتی ہیں وہ کھلنے کے عمل کو کھو دیتی ہیں اور وہ مرجھا جاتی ہیں۔

شاعر نے ضرورتِ شعری کے تحت تازگی کا قافیہ استعمال کر لیا ہے، جو کمزور مفہوم کو متبادر کرتا ہے۔ معنوی نقص بہر حال شمار ہوگا۔

روشنی میری جہاں تک جائے گی
اے قمر سب تیرگی چھٹ جائے گی

مندرجہ بالا مطلع کے دونوں مصرعے ایک ہی قافیہ رکھتے ہیں یعنی 'جائے'، جائے۔ جبکہ اس غزل کے دوسرے قوافی کہلائے، جھلائے وغیرہ ہیں۔

سب تیرگی۔ سب حشو میں شامل ہے اس کے بغیر پورا مطلب واضح ہے۔ ہاں سب تیرگی کے بجائے تیرہ شبی ہوتا تو زیادہ رواں مصرعہ ہوتا۔ رعایت قمر بھی ہوتی اور سب جو بھرتی کا لفظ ہے وہ بھی نہ آتا۔

رات دن حسن کی تخلیق کیا کرتا ہوں
آپ نے کب مرا اندازِ ہنر دیکھا ہے

انداز کا لفظ زوردار نہیں حسن کی تخلیق کا عمل ہے اس میں انداز سے زیادہ اعجاز ہنر
بہتر مرکب ہوگا۔ انداز کی ایک حد ہوتی ہے، لفظ اعجاز کی حد نہیں۔ اس میں جو خوبیاں ہیں
انداز میں نہیں، ہنرمندی کی طرفگی اعجاز سے لامحدود طور پر متبادر ہوگی۔ اعجاز ہی انسان دوچار
کرسکتا ہے۔

ایک ہجرت نے تو صدیوں کا سفر روک دیا
دیس سے اب کے بھی کیا دیس نکالا ہوگا

اعلیٰ ترین شعر ہے، ایک مبسوط تاریخ کا حامل ہے، کروڑوں افراد کی آپ بیتی ہے۔ روانی و
برجستگی میں بھی خوب تر ہے۔ اہلِ ہجرت کے خدشات کا ترجمان ہے۔ شاعر نے لوگوں کی
خصوصاً اہلِ ہجرت کی دھڑکنیں سمودی ہیں۔ فنی اعتبار اور زبان و بیان کے لحاظ سے بندش
مضبوط ہے۔

شعر تنقید کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہے۔ تنقیدی اصول کے تحت نقاد کی ذاتی پسند اور
رائے خاص اہمیت کی حامل نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود اگر نئے دیس کہا جاتا، تو شعر، اور بھی
واضح ہو جاتا۔ مثلاً ۔ کیا نئے دیس سے بھی دیس نکالا ہوگا

ہجرت کے بعد اس خطۂ ارض کو ہم اہلِ ہجرت نے اپنا وطن بنالیا ہے وہ ہمارے
لیے تو نیا دیس ہی کہلائے گا۔ ہاں ہماری ہونے والی اولاد جو اس سرزمین پر پیدا ہوئی ہے
اس کے لیے نیا دیس نہیں بلکہ اصلی مولد ہے۔ سقوطِ ڈھاکا نے ان خدشات کو بڑھادیا ہے۔
کیونکہ اہلِ ہجرت جو شرقی پاکستان میں تھے ان کو دوسری ہجرت کرنی پڑی

جان دی ہوگی کسی نے کسی مجبوری میں
یوں اجل، کون ترے منہ کا نوالہ ہوگا

مصرعۂ اولیٰ میں کہا گیا ہے "جان دی ہوگی" اس جملے سے متبادر ہوتا ہے ماضی
میں "جان دی ہوگی" مصرعۂ ثانی میں کہا گیا ہے کون ترے منہ کا نوالہ ہوگا" مجمل مستقبل ہے،
حالانکہ کہنا چاہیے تھا، کون ترے منہ کا نوالہ ہوا ہوگا، دوسرا مصرعہ بھی ماضی شکیہ ہی میں ہونا تھا
مگر وہ مستقبل میں ہے۔ اس شعر کی نثر اس طرح ہوگی۔

"کسی نے اپنی جان بہ مجبوری دی ہوگی (ماضی شکیہ) یونہی کون اے اجل

تیرے منہ کا نوالہ ہوا ہوگا۔" ردیف چونکہ مستقبل کی ہے اس لیے معنوی اعتبار سے مربوط نہیں ،نکل گئی ہے۔

مصرعہ اگر اس طرح ہوتا ۔

جان اپنی کوئی دے گا کسی مجبوری میں
یوں ، اجل کون ترے منہ کا نوالہ ہو گا

پہلے مصرعے میں جب زمانہ مستقبل لایا جائے گا تو ردیف سے معنوی ربط پیدا ہوگا۔ جان دی ہوگی کہنے سے ردیف نکل جائے گی اس لیے اس میں زمانہ ماضی احتمالی ہے۔ اور اگر "جان دی ہوگی" رہنے دیا جائے تو ردیف بدل جائے گی۔ یعنی: "یوں اجل کون ترے منہ کا نوالہ ہوتا" کہنا پڑے گا۔ لیکن ردیف کو نہیں بدلا جا سکتا۔ پہلے اور دوسرے مصرعے میں زمانہ مستقبل ہی کو لانا ضروری ہے۔ غور کیجیے میں نے غلط کہا ہے یا صحیح...... میری ذاتی رائے نہیں تنقید کی کسوٹی یہی کہتی ہے ۔

ایک در ایسا بھی ملتا ہے بھری دنیا میں
ہم نے شاہوں کا بھی جھکتے ہوئے سر دیکھا ہے

اس شعر کی نثر ہوگی۔ "اس بھری دنیا میں ایک آستاں بھی ہے" جہاں" ہم نے شاہوں کا سر بھی جھکتے ہوئے دیکھا ہے۔" لفظ جہاں کو، لائے بغیر دونوں مصرعے معنوی اعتبار سے مربوط نہیں ہوں گے، دولخت رہیں گے۔ اگر پہلا مصرعہ اس طرح ہوتا ۔

اس بھری دنیا میں اک ایسا بھی در ہے، کہ جہاں
ہم نے شاہوں کا بھی جھکتے ہوئے سر دیکھا ہے

اصولاً تو جہاں دوسرا ہی مصرعہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ دوسرے مصرعے کا کوئی جملہ یا لفظ پہلے مصرعے کے درمیان یا آخر میں لانا، بیان کا نقص شمار ہوتا ہے اس لیے اگر اس شعر کو ذرا سی ترمیم کر کے یوں بنا لیا جائے تو بالکل درست ہوگا۔ اور اس طرح مطلع بن جائے گا۔

ہم نے اس دنیا میں اک ایسا بھی در دیکھا ہے
جہاں شاہوں کا بھی جھکتے ہوئے سر دیکھا ہے

بھری کا لفظ حشو میں شامل ہے وہ نقص بھی نکل گیا اور جہاں جس کی اشد ضرورت

تھی وہ آ گیا۔ اب پرانے قاعدے سے یہ اعتراض کیا سکتا ہے کہ جہاں کا الف گر گیا ہے جسے پرانے شعرا نہیں گراتے تھے، مگر یہ پرانے قاعدے سے معمولی سقم کہلائے گا۔ جہاں کے نہ ہونے سے عجز بیان کا نقص تھا۔ جدید شعرا جہاں، وہاں، یہاں، کہاں، وغیرہ کے الف گرانا جائز سمجھتے تھے اور راقم الحروف اسی کا قائل ہے۔ اگر اس شعر کو نعت میں شامل کیا جائے تو بہت خوب ہے ورنہ غزل میں تاولاً اس کے معنی اعتبار رہو جائیں گے۔

فارسی کا شعر ہے۔

پرتوِ مہر بہ ویرانہ و آباد یکے ست
حسن گر تیغ کشد بندہ و آزاد یکے ست
غنیؔ کاشمیری

قمر جمالی کے شعر کا مطلب بھی مذکورہ شعر کے قریب نکلے گا یعنی ''حسن کا آستاں ہی ایسا ہے جہاں بادشاہوں کے سر بھی جھکتے ہیں۔

اس راز سے واقف ہیں فقط اہلِ محبت
احساسِ محبت ہی محبت کا زیاں ہے

لفظ احساس کی جگہ، اظہار، کا محل ہے۔ محبت کا احساس ہونا خوبی ہے۔ عرفان کے ضمن میں آتا ہے۔ احساسِ محبت کو زیاں سے تعبیر کرنا غلط ہے۔ اس لیے کہ محبت کو طشت از بام کرنا اچھا خیال نہیں کیا جاتا۔ ''اظہارِ محبت'' محبوب سے کرنا غلط نہیں لوگوں سے محبت کا اظہار وجہ شرک بن جاتا ہے۔

بچا کے رکھیں گے کب تک تجوریاں اپنی
جو ہنس رہے ہیں غریبوں کے پیٹ خالی پر

پیٹ خالی، ردیف پر کے ساتھ ثقالت پیدا کر رہا ہے، اور فصاحت پر گراں ہے۔ درست جملہ بنے گا، ''جو غریبوں کے خالی پیٹ پر ہنس رہے ہیں'' فقرۂ آخر'' پیٹ خالی پر'' میں تعقیب نے تعقل پیدا کیا ہے۔ روزمرہ میں خالی پیٹ ہی فصیح ہے۔ اگر ردیف ''پر'' کے بجائے'' ہے'' اور حرف اضافت لاتے تو، پیٹ خالی کی ترکیب بھی درست ہو جاتی۔ اردو میں صفت پہلے آتی ہے یہاں موصوف پہلے ہے۔ ضرورتِ شعری مجبور کرتی ہے مگر مصرعہ

مذکورہ پیٹ خالی کے بجائے "دست خالی" ہوتا تو ردیف "پر" کے ساتھ استحکام ہو جاتا اور تعقیب کا نقص بھی ختم ہو جاتا کیونکہ فارسی میں صفت موصوف کے بعد آتی ہے۔ پیٹ خالی اگرچہ ہندی سے اخذ کی ہوئی ترکیب ہے، مثلاً گلاب چہرہ، چاند چہرہ، پھول تن، ستارہ آنکھیں، دو رہن مکھڑا، وغیرہ مستعمل ہیں جو قرین قیاس ہیں، اس قسم کے مرکبات قیاسی کو اردو والوں نے قبول کرلیا ہے، لیکن محل استعمال پیش نظر رکھنا ہوگا۔ مصرعہ بالا میں "پیٹ خالی" کا محل استعمال ردیف پر نے بھونڈا بنا دیا ہے اور روزمرہ کے بالکل خلاف ہے۔

خدا کا، کام ہے وہ پرورش کرے نہ کرے
قمر چلو کوئی پودا لگا کے دیکھتے ہیں

جملہ، خدا کا کام ہے، کا محل استعمال غلط ہے۔ یہاں، خدا کی مرضی کا محل ہے، اور مصرعہ مفہوم بھی یہی دے رہا ہے۔ اس لیے مرضی، یا خدا کو اختیار ہے سے مذکورہ سقم جاتا رہتا ہے۔ اردو میں خدا کا کام کا جملہ بھی بولا جاتا ہے مگر اس کا محل استعمال دوسرا ہوتا ہے مثلاً خدا کے کاموں میں کسی کو دخل نہیں۔ خدا کے کام اور انسان کے کام میں بڑا فرق ہے۔ خدا کے کاموں میں کسی کو دخل نہیں روزمرہ نہیں جب کہ خدا کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں۔ روزمرہ میں شامل ہے۔ مذکورہ سقم کے علاوہ شعر معنوی اعتبار سے رجائی ہے اور حوصلہ مندی سے بھرپور ہے اور حوصلہ و ہمت کی ترغیب دیتا ہے۔

راہبر ہے نہ اب غبار راہ
میں اکیلا ہوں اپنی منزل میں

منزل کے لغوی معنی حاصل سفر، مرکز سفر، کے بھی ہیں اور وہ مقام آکر اترا جائے، ٹھہرا جائے، یعنی، پڑاؤ، سرائے، راستے کے حصے میں جہاں سفر کی تکان یا دیگر ضروریات کے لیے پڑاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ مکان کے مفہوم میں بھی مستعمل ہے۔ درجات اور مرتبے کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً وہ اعلیٰ منزل پر فائز ہے۔ اُن کی منزلیں خدا ہی جانے۔ اس کے علاوہ منازل قرآن سات ہیں۔ منزل قمر، منازل قمر، وغیرہ یہ اپنے اصطلاحی مفہوم میں زیادہ بولا جاتا ہے۔ جو قیاسی معنی اہل فارس اور اہل اردو نے قیاس کرلیے ہیں۔

منزل میں استعمال غلط ہے۔ یہاں ردیف میں کا محل نہیں "پر" کا ہے، اگر شاعر

فرماتے ۔ میں اکیلا ہوں راہِ منزل میں، تو میں کا استعمال درست ہو جاتا۔ اساتذہ نے منزل کو میں کی ردیف کے ساتھ استعمال کیا ہے مگر روزمرہ کے خلاف ہے اور ردیف کمزور رہتی ہے۔

جو تلاطم سے لڑ نہیں سکتے
گر نہ جائیں نگاہِ ساحل میں

نگہِ ساحل میں گرنا، درست استعمال نہیں ۔ شاعر صاحب، بیان یہ کرنا چاہتے ہیں ۔ جو تلاطم سے نہیں لڑ سکتے کہیں وہ ساحل کی نظر سے گر نہ جائیں یا اُتر نہ جائیں ۔ یہاں تلاطم اور ساحل بطور علامت کے ہیں ۔ ساحل سے، اگر ہوتا، تو میں کی وجہ سے جو سقم آ گیا ہے وہ ختم ہو جاتا، مگر ردیف میں ہے اس لیے شاعر صاحب نے سے کے بجائے میں کو درست سمجھ لیا حالانکہ محل استعمال سے کا ہے۔

نشیمن ہی نہیں، ہم بھی جلیں گے آگ برسے گی
ہمیں معلوم ہے اب کے بہار آنے سے کیا ہوگا

مصرعے میں بہار آنے سے کے بجائے، بہار آنے پر یا یہ کا محل ہے روزمرہ اور نحوی اعتبار سے یہی درست ہے ۔ بہار تو ہمیشہ ہی آتی ہے لیکن شاعر صاحب نے لفظ "اب کے رکھ کر" سے کے تعلق کو کمزور کر دیا ہے اور پہلے مصرعے میں بھی کہا ہے نشیمن ہی نہیں ہم بھی جلیں گے ۔ نشیمن تو ہمیشہ ہی جلتے تھے اس مرتبہ ہم بھی جلیں گے ۔ اب کے، استعمال کیا ہے تو، سے کے بجائے پر ہی استعمال زیادہ فصیح تھا۔

میں نے آنسو کبھی آنکھوں سے ٹپکنے نہ دیا
اُس کے دامن پہ جو گرتا تو ستارہ ہوتا

ایک آنسو دونوں آنکھوں سے کیسے ٹپکے گا ۔ "آنکھ سے آنسو کبھی میں نے ٹپکنے نہ دیا" ہونا چاہیے تھا۔ یا دوسرے مصرعے میں ذرا سی تبدیلی سے جمع کے ساتھ بھی درست ہو سکتا تھا۔

وہ دل مانوس ہو جاتا ہے مجھ سے
میں جس دل میں اُترتا جا رہا ہوں

وہ دل مانوس ہو جاتا ہے مجھ سے ۔ فعل حال ہے دوسرے مصرعے میں فعل

استمراری ہے اس لیے درست نہیں۔ مانوس ہو جاتا کا مقابل دل میں اُترتا ہوں۔ ہوگا۔ یا تو پہلے مصرعے میں فعل استمراری ہونا چاہیے۔ وہ دل مانوس ہوتا جارہا ہے۔ میں جس دل میں اُترتا جارہا ہوں۔

فاصلہ کم نہ ہو سکا اب تک
جو مرے اس کے درمان میں تھا

فاصلہ وہ نہ کم ہوا اب تک جو مرے اس کے درمیان میں تھا۔ مصرعے کے آخر میں جو ہے اس لیے اس کے لیے وہ لانا ضروری ہے ورنہ مصرعہ تشنہ رہ جاتا ہے۔ صلہ اور جواب موصولہ کا خیال ضروری ہے۔ اس طرح شعر فصیح ہو جاتا ہے۔ ورنہ کمی محسوس ہوتی ہے۔

جانے وہ میں ہوں، یا ترا چہرہ
کس کی تصویر میرے دل میں ہے

شاعر یا عاشق خوب جانتا ہے، کہ میرے دل میں جو تصویر ہے وہ محبوب ہی کی ہے، لیکن جملہ "جانے وہ میں ہوں" کہہ کر محبوب سے سننا چاہتا ہے، کہ وہ کہے، نہیں وہ تیری تصویر نہیں میری تصویر ہے۔ شاعر ایک نفسیاتی حربہ استعمال کر کے خوبصورتی سے محبوب سے اقرار کرانا چاہتا ہے، اگر شاعر کا مقصد یہ ہوتا کہ اُسی کی تصویر ہے، تو محبوب کی نفی ہو جاتی، اسی لیے اُس نے دانستہ بے خبری کا لفظ "جانے" استعمال کیا ہے، یہ لفظ محبوب سے سوال ہے۔ شعر اچھا ہے مگر ایک کمی ضرور محسوس ہوتی ہے ہر لفظ اپنے الگ معنی رکھتا ہے۔ لفظ "چہرہ" پورے جسم کا عکاس نہیں وہ جسم کا صرف ایک حصہ ہے اگر چہ وہ جسم کا اہم حصہ ہے جس کی وجہ سے شناخت ہوتی ہے چہرے کے بغیر پہچان ممکن نہیں، لیکن چہرہ، تصویر نہیں ہوتا تصویر انسان کے سراپے کے لیے ہے، جس میں چہرے کے ساتھ تمام اعضاء شامل ہوتے ہیں۔ چہرے کے بجائے اگر صورت ہے کہا جاتا، تو تصویر کے پورے معنی واضح ہو جاتے۔ میری صورت ہے یا تری صورت کہہ کر، شعر میں جو معنوی کمی رہ گئی ہے وہ ختم ہو جاتی۔ چہرے کو تصویر کے معنی زبردستی پہنا کر شعر کا مفہوم لینا عجز بیان ہے۔

روزِ محشر، دیکھنا یہ ہے قمرؔ!
کون کس کو دیکھ کر شرمائے گا

شاعر کا مقصد ہے قیامت کے دن حساب ہوگا، تو شرم وندامت صرف محبوب ہی کو ہوگی، کیونکہ اُسی نے ظلم و جفا کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ مظلوم کو شرم کیوں آئے گی۔ شعر کا سلیقۂ بیان اچھا ہے۔

روزِ محشر کا استعمال معنوی اعتبار سے بالکل غلط ہے۔ یہاں روزِ حشر کا محل تھا یعنی قیامت کے دن۔ اس روز جس دن سب اُٹھائے جائیں گے۔ یومِ بعث ونشر، یوم النشو، یومِ معاد، وغیرہ محشر میں خود، روز کا مفہوم شامل ہے اس کے ساتھ، روز یا یوم، لانا قواعد کے اعتبار سے غلط ہے اور استعمال اس کا مستند شعرا فصیح تر نہیں مانتے۔ فارسی شعرا نے یومِ محشر، روزِ محشر لکھا ہے، مگر مستند ترین اردو شعرا نے اس کی تقلید نہیں کی۔ محشر خود اس طرف مکان ہے۔ یوم، دن، روز کا تصور اس میں موجود ہے۔ اس لیے روزِ حشر، یومِ حشر، حشر کا دن، لکھنا زیادہ فصیح ہے۔ ''حشر کے دن دیکھنا ہے یہ قمرؔ'' لکھنا بہتر تھا۔ مولانا روم کا شعر ہے۔

روزِ محشر، کہ جاں گداز بود
اوّلیں پرسشش نماز بود

مگر فارسی شعرا نے جو غلط رسم قائم کی ہے اس کی تقلید ضروری نہیں۔

بڑھتے رہو تخریب سے تعمیر کی جانب
سنتے ہیں کہ ترشے تو ابھرتا ہے شجر اور

شعر اچھا ہے غالب اور دوسرے شعرا نے بھی اس خیال کو بکثرت نظم کیا ہے۔ قمرؔ جمالی نے بھی اچھی طرح کہا ہے۔ مگر ابھرنا کے فعل پر اعتراض ہوگا۔

ترشنے کے بعد درخت بڑھتا ہے۔ اس کی بالیدگی اور نشو و نما مزید ہو جاتی ہے۔ اُبھرنے کا عمل پہلے ہوتا ہے۔ وہ بیج سے نہال، پودا یا درخت کی شکل میں آگیا۔ اس لیے تراش کے عمل سے گزار کر اُسے بڑھوتری کی جانب یعنی بڑھنے کی طرف مائل کیا گیا ہے۔ اگر ذرا سی ترمیم سے یوں کہتے۔

''سنتے ہیں ترش جائے تو بڑھتا ہے شجر اور''

میں مثلِ قمرؔ ہوں یہی پہچان ہے مری
اب تک یہ زمانہ مجھے پہچانتا نہیں ہے

پہلے مصرعے میں ضمیر بعد میں ہے جو درمیان میں آ سکتی تھی یعنی "میں مثلِ قمر ہوں مری پہچان یہی ہے" دوسری بات جن قوافی کا حرفِ آخر ہائے ہوز ہو اُن میں ایسے قوافی نہیں لاتے جن کا حرفِ آخر الف ہو۔ الف کے قوافی میں ہائے ہوز کا قافیہ آ سکتا ہے۔ ہائے ہوز کے قوافی میں الف کا قافیہ بیجانا۔ درست نہیں۔ قمر صاحب نے جدید اور فن سے بے بہرہ ہو کر تقلید کی ہے۔ غالباً یہ اُن سے سہو ہوا ہے ۔

کس کو اپنا کہے وہاں، کہ جہاں
اپنے سائے سے لوگ ڈرتے ہیں

شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں "کہے" استعمال ہوا ہے۔ جس میں حرفِ اشارۂ بعید کی ضرورت ہے۔ حرفِ اشارہ کے بغیر، تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ یا کہے کی جگہ کہیے لکھتے تو یہ سقم ختم ہو جاتا۔ یا کہوں یا کہیں سے ضمیر اشارہ کی کمی کو پورا کیا جا سکتا تھا ۔

کس کو بتلاؤں میں، کہ اُس کے بغیر
کتنے بے کیف دن گزرتے ہیں

شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں بتلاؤں کی جگہ بتاؤں لکھتا تھا جو فصیح تر تھا۔ بتلاؤں کا فعل غیر فصیح ہے۔ اساتذۂ متاخرین و متوسطین نے بتاؤں کی جگہ بتلاؤں لکھنے سے احتیاط کی ہے زبان میں اسے عوام کی زبان سے تعبیر کیا گیا ہے ۔

کس سے پوچھوں کون بتلائے مجھے
جانے میں کس کام پر معمور ہوں

شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں بتلائے کی جگہ بتائے لکھنا فصیح تھا۔ بتلائے غیر فصیح ہے۔ مستند اساتذہ حال و متوسط نے غیر فصیح بتایا ہے ۔

کس کو ترے بغیر جانِ حیات
آرزوئے حیات باقی ہے

مصرعۂ اولیٰ میں کس کے ساتھ علامت مفعول کو کی جگہ حرفِ جار میں کی ضرورت ہے ورنہ مصرعۂ ثانی کا تعلق مصرعۂ اولیٰ سے قائم نہیں ہوگا۔ شعر کی نثر یہ ہوگی اور "اب جانِ حیات ترے بغیر کس میں زندگی کی تمنا باقی ہے اس روشنی میں کو کا محل نہیں رہتا صرف میں

حرف جار ہی آئے گا "کس میں ترے بغیر جانِ حیات"

دو گھڑی آ کے آپ بیٹھیں تو
ہم بھی ہیں شایہ شجر کی طرح

ضمیر سے پہلے فعل نہیں لانا چاہیے، اگر شعری مجبوری نہ ہو، مندرجہ بالا شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں، فعل آ کے پہلے آیا ہے اور ضمیر آپ بعد میں یہ آسانی تقدیم و تاخیر سے ہو سکتی تھی۔ اس سے مصرعہ زیادہ فصیح اور تعقیب سے پاک ہو جاتا۔ یعنی "دو گھڑی آپ آ کے بیٹھیں تو"

مجھ کو زخموں کی شکایت ہے نہ شکوہ نہ ملال
رونا اس بات کا ہے اس نے نہ مارا پتھر

مصرعۂ اولیٰ میں لفظ شکایت اور شکوہ ہم معنی ہیں اس لیے دونوں کو، حرف عطف کے ساتھ لانا تھا۔ مصرعے میں استعمال ہے "شکایت ہے، نہ شکوہ"۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے گویا دوسرے معنیٰ کا لفظ ہے۔ ذرا سے تغیر سے یہ دونوں لفظ معطوف ہو سکتے تھے۔ یا کوئی دوسرا لفظ مضمون کی رعائت سے لایا جاتا۔ چونکہ وزن کی وجہ سے معطوف ہونا مشکل تھا اس لئے کوئی دوسرا لفظ رکھتے۔

میں تو پھل دار پیڑ تھا کل تک
بے ثمر کر دیا گیا ہے مجھے

بعض مستند اساتذۂ قدیم و جدید نے لفظ پیڑ کو متروکات میں شامل کیا ہے مگر صرف نظم کے لیے، نثر میں استعمال کو جائز لکھا ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں یہ غلط ہے کہ اردو کے دامن کو وسیع کرنے کے بجائے کم کر دیا جائے، مناسب نہیں، جس طرح "مت"، "تلک"، "تئیں" وغیرہ کو متروک کر دیا گیا ہے۔ جن کے بدل ان متروک الفاظ کے مقابلے میں زیادہ مترنم اور، رواں نہیں۔ پیڑ کے مقابلے میں درخت زیادہ رواں نہیں۔ بس میں پیڑ کو متروک نہیں مانتا۔ لیکن جو پرانے فنی اصولوں کو مانتے ہیں ان کی نظر میں ضرور غیر فصیح ہو گا۔

کب جھکایا ہے، کہیں سر میں نے
تو ہی بتلا ترے در سے پہلے

آج کل تو ہیں سبھی بھٹکے ہوئے
کون کس کو راستہ دکھلائے گا

❖❖

خود پکار اٹھیں گے ہر چہرے کے داغ
وقت جب بھی آئینہ دکھلائے گا

❖❖

قمر اس عہد نو کے جو تقاضوں کو نہیں سمجھے
انہیں تصویر مستقبل کی دکھلانے سے کیا ہو گا

❖❖

کون کیسا ہے یہ میں نے آج تک سوچا نہیں
خود ہی اپنے آپ کو آئینہ دکھلاتا رہا

❖❖

عمر بھر دیکھا ہے اُس کو تیرہ بختی کا شکار
جو اندھیرے میں کسی کو روشنی دکھلائے ہے

❖❖

خوف آتا ہے مجھے خود اس کا چہرہ دیکھ کر
جب بھی کوئی کسی کو آئینہ دکھلائے ہے

❖❖

کس سے پوچھوں کون بتلائے مجھے
جانے میں کس کام پر معمور ہوں

مندرجہ بالا اشعار کے ثانی مصرعوں میں فعل متعدی کا صیغہ دکھلائے اور بتلائے استعمال ہوا ہے جبکہ اس کی جگہ فعل لازم "بتانا" اور "دکھانا" نے متروکات جائز میں دکھلائے بتلائے ، سکھلائے کے استعمال کو، غیر فصیح قرار دیا ہے۔ یاد رہے تمام فعل متعدی متروکات میں شامل نہیں صرف چند کو متروک کیا ہے

سفر میں راہزنوں کی تو فکر کیا کرتا
قدم قدم پہ مجھے خوف راہبر کا ہے

شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں رکن عروض، کرتا ماضی شرطی میں ہے۔ مصرعۂ ثانی میں حرف فعل حال کی علامت '' ہے'' استعمال ہوا ہے۔ یعنی مصرعۂ اولیٰ گزرے ہوئے زمانے میں ہے لہٰذا یہ شاعر سے سہو ہوا ہے۔ کرتا کے بجائے فعل مضارع واحد متکلم '' کروں'' آنا چاہیے تھا۔ ذرا سی تبدیلی کے بعد مصرع اگر یوں ہوتا '' سفر میں راہزنوں کی تو فکر کیسے کروں'' تو یہ سہو دور ہو سکتا تھا۔ اس غزل کے باقی اشعار بہت صاف، رواں اور شگفتہ ہیں۔ ان میں کوئی فنی سقم بھی نہیں۔ اس غزل کے تیسرے شعر میں غالباً '' معجزہ'' کے بجائے مجوزہ کتابت ہو گیا ہے۔

معجزہ نبی مافوق الفطرت فعل کو کہتے ہیں جسے سمجھنے سے عام آدمی قاصر ہو۔ یہی معجزہ والی کیفیت اگر کافر سے صادر ہو تو استدراج کہتے ہیں۔ اور مافوق الفطرت کام کسی ولی سے صادر ہو تو کرامت کہلاتا ہے۔ یہ تینوں لفظ مخصوص ہیں اس لیے کسی اور کے لیے معجزہ کا لفظ لکھنا اہلِ زبان کے خلاف ہے۔ مگر اکثر شعرا اس کے پابند نہیں۔ بہر حال غلطی تسلیم کی جائے گی۔ معجزہ کے مترادف الفاظ استعمال کرنا چاہیے۔

کس نے آنکھوں میں بسایا ہے تجھے
آج تک میری نظر سے پہلے

محولہ بالا شعر کے مصرعۂ ثانی میں '' نظر'' کو آنکھ کی جگہ نظم کیا گیا ہے۔ '' نظر'' آنکھ کا آکر بینش ہے یہ اسم طرف مکان کی جگہ نہیں لے سکتا آنکھ اسم طرف مکان ہے۔ نظر کا استعمال آنکھ کا بدل نہیں ہو سکتا۔ یہ معنوی سقم شمار ہوگا۔ بسانے کا عمل آنکھ کرتی ہے نظر نہیں۔ نظر صرف دیکھنے کا فعل کرتی ہے۔ زبان کی باریکیاں ہر لفظ کے صحیح استعمال پر توجہ دلاتی ہیں۔ الفاظ سے شعر کا مفہوم متبادر ہوتا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے۔

'' جب تک میں نے اپنی آنکھوں میں نہیں بسایا تھا، تجھے کسی نے بھی اپنی آنکھوں میں نہیں بسایا۔'' اگر اس شعر کے دوسرے مصرعے کو معنی پہنا کر یہ معلوم کیا جائے، کہ جب تک تو میری نظر سے نہیں گزرا، آج تک اپنی آنکھوں میں کس نے تجھے بسایا ہے۔ آج تک

کا لفظ پہلے مصرعے میں آنا تھا جو دوسرے مصرعے کے رکن صدر میں آیا ہے جو ایک نقص ہے اسے شکستِ ناروا میں شمار کرتے ہیں۔ شعر کی نثر یوں بنے گی۔ "آج تک تجھے کس نے اپنی آنکھوں میں بسایا ہے۔ میری نظر میں آنے سے پہلے یا میری آنکھ میں بسنے سے پہلے۔"

اے قمر اُس وقت اک مجرم سا بن جاتا ہوں میں
کر کے نیکی جب بُرائی سامنے آ جائے ہے

مصرعے میں تعقیب ہے۔ کر کے نیکی کے بجائے نیکی کر کے لکھنا فصیح تر تھا۔

تو لاکھ بھلا دے مجھے اے جانِ تمنا
ہوں تیرا پرستار، پرستار رہوں گا

شعر کے مصرعۂ اولیٰ کی تعقیب کو درست کیا جاسکتا تھا مثلاً

اے جانِ تمنا تو مجھے لاکھ بھلا دے
ہوں تیرا پرستار، پرستار رہوں گا

اگر تعقیب الفاظ کی تقدیم و تاخیر سے نکل جائے تو ضرور نکال دینی چاہیے۔

ہر ظلم کی زنجیر کو، کانوں گا قلم سے
معلوم ہے مجھ کو، کہ سر دار رہوں گا

اس شعر کا مصرع اپنے مصرعۂ ثانی سے معنوی اور لفظی طور پر مربوط نہیں ہے۔ شعر دولخت معلوم ہوتا ہے۔ مصرعۂ ثانی میں سر دار کے بجائے بر سر پیکار کا محل ہے۔ "ہر ظلم سے میں بر سرِ پیکار رہوں گا" کہہ کر مصرعۂ اولیٰ سے معنوی و لفظی ربط پیدا ہو سکتا تھا۔ سر دار پہنچ کر ظلم کی زنجیر کاٹی جا سکتی ہے۔

ہر طرف سارے زمانے میں اندھیرا ہوتا
بقعۂ نور اسے ہم نے بنا رکھا ہے

شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں ہر طرف بے ضرورت ہے، صرف وزن پورا کرنے کے لیے ہے "سارے زمانے" کہنے سے پہلے ہر طرف کہنے کی معنوی دلیل کوئی نہیں یہ "حشو" میں شامل ہے۔ کمزور بندش ہے۔ ہر طرف کے بغیر معنی بھرپور نکلتے ہیں۔ لفظ سارے سے تو ہر طرف کے معنی خود متبادر ہیں۔ یا صرف ہر طرف لکھنا تھا تو سارے نہ لکھا جاتا۔

تم نے چھیڑا تو کسی وقت بپھر سکتا ہے
میں نے طوفان جو سینے میں دبا رکھا ہے

کسی وقت بپھر سکتا ہے۔ معنوی کمزوری متبادر کرتا ہے، جب چھیڑا جائے گا اُسی وقت کیوں نہیں بپھرے گا۔ بعد میں کیوں بپھرے گا۔ محل نظر ہے۔ کسی وقت کی ضرورت نہیں۔ دوسرے مصرعے کی تعقیب درست ہوسکتی تھی یعنی۔

''میں نے سینے میں جو طوفان دبا رکھا ہے''

❖❖❖

زخم کھاتے رہے مسکراتے رہے
ہم خزاں میں نئے گل کھلاتے رہے

شعر کے مصرعۂ آخر میں اردو محاورے، گل کھلانا سے گل کھلاتے رہے بنا کر استعمال کیا گیا، لیکن گل کھلاتے رہے کے معنی پھول کھلاتے رہے متبادر نہیں ہوتے۔ اردو زبان میں جو لفظ بطور محاورہ بولا جانے لگے۔ اس کے حقیقی یعنی لغوی معنی نہیں لیتے، بلکہ مجازی معنی جو اہلِ زبان نے متعین کردیے ہیں صرف وہی معنی لیے جاتے ہیں۔ اگر کوئی یہ جواز پیش کرے کہ گل کھلانا کے معنی، پھول کھلانا بھی ہیں اور انوکھی بات یا کام کرنا بھی ہیں اس لیے غلط کس طرح ہوسکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب اہلِ زبان کسی لفظ یا جملے کے باقی تمام معنی ساقط ہوجاتے ہیں صرف محاورے کے لیے جو معنی مستنبط کیے ہیں وہی مستعمل ہوتے ہیں۔ گل کھلنا اور گل کھلانا۔ دونوں محاورے ہیں اور ان مجازی معنی جو متعین کیے گئے ہیں وہ طوفان اُٹھنا، فساد کھڑا کرنا کے ہیں۔ روزمرہ بول چال میں سنا جاتا ہے اس نے کیا گل کھلایا ہے۔ دیکھو وہ کیا گل کھلاتا ہے۔ اب کوئی نیا گل کھلنا باقی ہے، وغیرہ۔ مصرعے میں ذرا سی ترمیم سے پھول کھلاتے رہے لاسکتے تھے۔ گل کھلاتے رہے تو مطلب فساد برپا کرتا رہے گا یا کوئی ایسا انوکھا کام کرتے رہے۔ اگر مصرعہ یوں ہوتا، تو بیان کا سقم دور ہوجاتا۔

''پھول ہم بھی خزاں میں کھلاتے رہے''

ممکن ہے نکل آئے ادھر کوئی مسافر
صحرا میں لگاتے چلو دو چار شجر اور

صحرا میں شجر لگانے سے کیا مقصد حاصل ہوگا۔ صحرا یا جنگل عام راہ گزر نہیں ہوتے نہ صحرا سے کوئی قافلہ گزرتا۔ ہاں صحرا کے درمیان میں جو عام راستہ بن گیا ہو جس پر آمد و رفت ہو۔ کوئی قافلہ یا مسافر عام راہ گزر ہی سے سفر کرتا ہے، اگر وضاحت کے لیے صحرائی راہ گزر کہا جاتا تو معنی پہنائے جا سکتے تھے۔ معنوی جھول کم ہو جاتا۔ دوسری بات یہ ہے، کہا گیا ہے صحرا میں لگاتے چلو دو چار شجر اور اس سے متبادر ہوا (معلوم ہوا) کہ پہلے بھی صحرا میں درخت لگائے جا چکے ہیں۔ اب مزید شجر لگانے کا مشورہ ہے۔ قاعدہ یہی ہے کہ مسافروں کے آرام کے لیے اسی رہ گزر پر شجر لگائے جاتے ہیں جہاں آمد و رفت ہو، تاکہ مسافروں کو سایہ میسر رہے۔ تاویل کی جا سکتی ہے عام رہ گزر سے بھٹک کر کوئی مسافر صحرا میں پہنچ جائے تو اس کے لیے درخت لگا دیے جائیں۔ مگر فلاحی کام جتنے ہیں وہ اجتماعی مفاد کے لیے ہوتے ہیں۔ اگر کہا جائے مسافر سے مراد کوئی دیوانۂ عشق ہے اُس کے لیے یہ کہا گیا ہے تاکہ اُسے سایہ ملے اُسے تکلیف نہ ہو تو جواب ہوگا دیوانۂ عشق سائے کی طلب سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اُسے سائے کی خواہش نہیں ہوتی، تو عام رہ گزر یا شہر چھوڑ کر صحرا نوردی کی زحمت نہ اٹھاتا۔ اس تناظر میں لفظ صحرا سے شعر میں معنوی جھول آ گیا ہے۔ جو سرسری طور پر اگر شعر کو پڑھا جائے تو معلوم نہیں ہوتا، مگر بغور پڑھا جائے تو یہ جھول ضرور محسوس ہوتا ہے۔ اگر استعارتاً شجر سے مراد اچھے کام بنی نوع انسان کے فائدے کے کام ہوں اور صحرا سے مراد، معاشرہ، ماحول، دینا تو یہ صرف معنی پہنانا ہوں الفاظ سے یہ مفہوم ظاہر نہیں۔ ذرا سی ترمیم سے اس شعر میں معنوی جھول نکل سکتا تھا۔

آئے گا کڑی دھوپ میں جب کوئی مسافر
میں اُس کے لیے سایۂ دیوار رہوں گا

شاعر کا مافی الضمیر یہ ہے۔ جب کوئی مسافر سفر کرتے ہوئے دھوپ میں آئے گا تو میں اُس کے لیے سایۂ دیوار رہوں گا (یعنی سایہ بن جاؤں گا) کڑی دھوپ اور سایۂ دیوار بطور علامت استعمال ہوتے ہیں۔ کڑی دھوپ مصائب و مشکلات کا استعارہ ہے اور سایۂ دیوار، سہولت و آرام کا استعارہ ہے۔ معنوی اعتبار سے سایۂ دیوار کا استعمال محل نظر ہے۔ مسافر کڑی دھوپ، اور راہ گزر کی رعایت سے تو سایۂ شجر یا سایۂ اشجار کا استعمال زیادہ صحیح

تھا۔ کیونکہ سفر کے ختم ہونے کا اشارہ نہیں ہے اس لیے سفر جاری رہنے کا اظہار ہو رہا ہے اس لیے راستے میں مسافروں کی سہولت کے لیے کنارے کنارے درخت لگائے ہیں۔ پھر ردیف "رہوں گا" سے سائے کے جاری رہنے کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس روشنی میں بھی سایۂ شجر ہی کا استعمال درست تھا۔ مصرعۂ اولیٰ سے ظاہر ہے کہ مسافر سفر کر رہا ہے مگر ابھی کڑی دھوپ میں نہیں ہے۔ ہاں جب وہ کڑی دھوپ میں آئے گا تو مستقل اس کے لیے سایۂ دیوار بنا رہوں گا۔ ردیف "رہوں گا" سے یہ معنی بھی متبادر ہوتے ہیں کہ جیسے سایۂ دیوار بننے والے کو معلوم ہے، کڑی دھوپ قائم رہے گی اس لیے وہ سایۂ دیوار بنا رہے گا۔ مسافر کے لیے سایہ اشجار سے بہتر مرکب نہیں۔ راستے میں دیوار نہیں ہوتی۔ اشجار ہوتے ہیں۔

سایۂ دیوار کا مرکب اس صورت میں درست ہوگا جب مسافر سفر ختم کر لے اس کے لیے کڑی دھوپ میں" کے بجائے" کڑی دھوپ سے" لکھنا ہوگا۔ سایۂ دیوار کسی بھی تاویل سے مصرعے میں درست مرکب نہیں ہے۔

کوئی میری خبر نہیں لیتا
بے خبر کر دیا گیا ہے مجھے

خبر لینا سے مراد، خبردار، رکھنا نہیں، بلکہ دیکھ بھال کرنا، مدد کو آنا، حال دریافت کرنا، نگرانی کرنا کے ہیں۔ خبر نہیں لیتا سے معنی متبادر ہوں گے نظر انداز کر دینا یعنی دیکھ بھال نہ کرنا۔ خبر نہ لینا محاورہ ہے۔ جس کے معنی اوپر لکھے گئے ہیں۔ اس لیے دوسرے مصرعے میں بے خبر سے مراد یہ ہرگز نہیں ہوگی کہ میری دیکھ بھال اور حال دریافت کرنے والا نہیں۔ بے خبر کے لفظی معنی بھی متبادر ہوں گے یعنی میں حالات وکوائف زمانہ سے آگاہ نہیں رہا۔ اس لیے مصرعۂ اولیٰ سے مصرعۂ آخر معنوی مطابقت نہیں رکھتا۔ اس لیے یہ شعر دولخت ہے۔ پہلے مصرعے میں خبر لینا، محاورہ ہے اور محاورے کے معنی نہیں بدلے جاسکتے اور مصرعے میں یہ اسی مفہوم میں لیا جائے گا۔ دولخت کا عیب دور کرنے کے لیے یا تو پہلا مصرعہ بدلا جائے یا مصرعۂ آخر میں تبدیلی کی جائے۔ خبر لینا کے محاوراتی معنی، سزا دینا، مارنا اور لعنت ملامت کرنے کے بھی ہیں اس کا استعمال کچھ اچھا نہیں اس لیے مناسب یہی تھا۔ اس غزل کے باقی اشعار بہت اچھے اور پُر اثر ہیں

کوئی مجھ کو خبر نہیں دیتا
بے خبر کر دیا گیا ہے مجھے

تیل جب تک دیے کے اندر ہے
لو بڑھاتے رہو تو بہتر ہے

اندر، کا لفظ بیچ اندرون کے مفہوم میں مستند شعرا نے متروک کر دیا ہے۔اس کے لیے ''میں'' ہی استعمال کیا ہے۔راقم الحروف کے خیال میں اس طرح کا ترکِ الفاظ ذخیرۂ الفاظ میں کمی کرنا ہے مگر اہلِ زبان نے اس کا ترک کرنا بہتر جانا گھر کے اندر کے بجائے گھر میں لکھتے۔ برتن کے اندر کے بجائے برتن میں لکھنا زیادہ فصیح لکھا گیا ہے۔اس روشنی میں مصرعہ غیر فصیح شمار ہوگا۔لفظ اندر نثر میں تو استعمال کر سکتے ہیں شعر میں نہیں۔

دوسرا اعتراض یہ ہوگا کہ جب تیل دیے میں موجود رہے گا لو بڑھانے کی ضرورت نہیں، لو بڑھانے کا عمل جب کیا جاتا ہے جب دیے میں تیل ختم ہونے کے قریب ہو۔لو اور دیا بطور علامت کے استعمال ہوا، مگر مفہوم لفظوں کے مطابق لیا جائے گا اس لئے شعر میں کمزور پہلو آ گیا ہے۔باقی اشعار اس غزل کے بہت صاف اور عمدہ ہیں۔

جس کی لے کوئی نہ تھی وہ گیت بھی ہم نے سنا
اشک بن کر جو نگاہِ ناز پر گایا گیا

اشک بن کر، درست استعمال نہیں۔''اشک بنا گئے'' صحیح استعمال ہے۔معنی پر غور کرنے سے اشک بن کر جملہ بے محل اور غلط نظر آئے گا۔

پوشیدہ نہیں اُس سے مرا دردِ نہاں بھی
اے کاش! سمجھتا وہ محبت کی زباں بھی

مصرعۂ اولیٰ میں دردِ نہاں کا مطلب محبت ہی تو ہے اور وہ جانتا ہے تو پھر محبت کی زبان سے کیا مطلب ہے، محبت کو محسوس کر لینا اس بات کی دلیل ہے کہ محسوس کرنے والا محبت کی زبان جانتا ہے جبھی تو محبت کرنے والے کے دردِ نہاں (محبت) سے واقف ہے مصرعۂ آخر میں زبان کا قافیہ پہلے مصرعے کے مفہوم سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں۔شعر

معنوی اعتبار سے کمزور ہے۔

محبت کی زباں میں ہم محبت جس کو کہتے ہیں
خلش دل کی ہمیں یہ معتبر معلوم ہوتی ہے

مصرعہ اولیٰ میں 'جس' آیا ہے اس کے جواب میں یہ کا محل نہیں۔ وہ کا محل تھا۔ دل کی خلش کو محبت سے تعبیر کیا ہے۔ اور محبت کے لیے اشارہ بعید استعمال ہوا ہے دوسرے مصرعے میں بھی اشارہ بعید ہی آنا تھا۔

وہی ایک روز، راہِ راست پر لے آئے گی مجھ کو
وہ گمراہی جو میری ہم سفر معلوم ہوتی ہے

ردیف "معلوم ہوتی ہے" غیر یقینی صورت حال کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ یعنی اس میں احتمال کا پہلو بھی شامل ہے۔ "راہِ راست پر لے آئے گی مجھ کو" کا جملہ یقینی صورت حال کو پیش کرتا ہے۔ اس لیے ردیف معنوی اعتبار سے کمزور پڑ گئی ہے۔ اس شعر کی نثر اس طرح ہوگی۔

"وہ گمراہی جو میری ہم سفر معلوم ہو رہی ہے وہ مجھ کو ایک سیدھی راہ پر لے آئے گی، مگر معلوم ہوتی سے یہ بھی اعتبار ہوتا ہے کہ ہم سفر نہ بھی ہو۔ شک کا پہلو نکلتا ہے اس لیے پہلے مصرعے میں غیر یقینی اور احتمالی مفہوم کو ظاہر کرنا بھی ضروری تھا۔ اس لیے لفظ شاید لا کر ردیف کو مضبوط کیا جا سکتا تھا مثلاً مصرعے میں ذرا سا ردو بدل کر کے کہا جا سکتا تھا اس طرح تعقیب بھی نکل جاتی۔

ہمیں اک روز، راہِ راست پر لے آئے وہ شاید
جو گمراہی ہماری ہم سفر معلوم ہوتی ہے

یا پھر یہ کہا جاتا، کہ "جو گمراہی میری ہم سفر ہے" وہ مجھ کو راہِ راست پر لے گی۔ مگر ردیف کی مجبوری ہے۔ ردیف "معلوم ہوتی ہے" سے احتمال بہرحال قائم رہتا ہے۔

شب غم کی سیاہی میں سحر معلوم ہوتی ہے
مجھے یہ سازشِ وہم و نظر معلوم ہوتی ہے

وہم کے معنی ہیں بغیر کسی ارادہ و قصد کے دل کا کسی چیز یا خیال کی طرف جانا، وہم

ہمیشہ خیالات فاسد پیدا کرتا ہے۔ بس نظر نے شبِ غم کی سیاہی میں بے ارادہ و قصد سحر محسوس کر لی۔ جب وہم بے ارادہ و قصد کسی طرف جاتا ہے تو سازش کا لفظ بے معنی ہو جاتا ہے کیوں کہ سازش ارادہ و قصد اور سوچ بچار کے ساتھ ہوتی ہے۔ بے ارادہ اور سوچ کے نہیں کی جاتی جب مصرعے کی معنویت پر غور ہوگا تو سازش کا لفظ بے محل نظر آئے گا۔ سازش کے بجائے دوسرا لفظ لانا تھا جس میں ارادہ و قصد کا دخل نہ ہو۔ اگر "صورتِ وہم نظر" کہتے تو یہ سقم معنوی نکل جاتا۔ صورت نہ سہی کوئی ایسا لفظ بہر حال لانا تھا جو سازش کی طرح ارادہ و قصد اور سوچ کا حامل نہ ہو۔ بہت سے لفظ مل سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ وہم کے حقیقی معنی یہی ہیں کہ وہ فاسد خیالات ہی کو جنم دیتا ہے۔ جو بغیر سوچ اور ارادے کے دل و ذہن میں آ جائیں۔ قوتِ واہمہ کہتے ہی اُسی کو ہیں جو عام طور پر غیر عقلی امور سامنے لاتی ہے۔

اک در کے سوا ہم نے قمرؔ غیر کے آگے
سیکھا ہی نہیں آج تلک سر کو جھکانا

غیر کی ضد، در نہیں ہوگا۔ شاعر کہنا یہ چاہتے ہیں "ہم نے ایک در کے سوا کسی دوسرے در کے سامنے سر کو جھکانا سیکھا ہی نہیں ہے۔"

اک در کے سوا ہم نے کسی در کے مقابل
سیکھا ہی نہیں آج تلک سر کو جھکانا
اک در کے سوا اور کسی در کے مقابل

❖❖

سیکھا ہی نہیں ہم نے قمرؔ سر کو جھکانا
ہے شرک کا اظہار قمرؔ سر کو جھکانا

یاد رہے تنقید کی توضیح کے لیے مصرعے مثالاً دیئے گئے ہیں اصلاح مقصود نہیں۔ ذرا غور و فکر سے بہتر سے بہتر مصرعے خود شاعر کہہ سکتے ہیں۔ نشاندہی ضروری ہے ورنہ تنقید کا مقصد بے معنی ہو جاتا ہے۔

گھر کیسے، پرندوں کی طرح لوٹ کے جائے
جس کو • میسر ہو کہیں کوئی ٹھکانہ

گھر کیسے، کہہ کر تو گھر ہونے کا اظہار کر دیا ہے۔ جب ٹھکانہ یعنی گھر میسر نہیں جبھی تو پرندوں کی طرح کوئی نہیں لوٹے گا اس کا سفر جاری ہے جہاں بھی تھکن کا احساس ہوگا بسیرا کر لیا جائے گا، شاعر کو گھر کی جگہ وہ لانا چاہیے تھا۔

وہ کیسے پرندوں کی طرح لوٹ کے جائے

"گھر کیسے" لانے سے اس بات کی نفی ہو جاتی ہے جس کو ظاہر کیا جا رہا ہے، غور کرنے پر یہ معنوی سقم سامنے آ جاتا ہے۔

ہو جس بندے کا مسلک فقر و فاقہ
سمجھ لو بادشاہت کر رہا ہے

بندہ، بندے، بندی، انسان کے معنی میں اہلِ پنجاب کی اردو ہے۔ اہلِ زبان انسان کے بجائے بندہ نہیں بولتے۔ وہ، آدمی، شخص، انسان، ہی بولتے ہیں۔ اس لیے یہ خلاف اہلِ زبان ہے، اور مستند اہلِ ادب احتیاط کرتے ہیں بندہ مخصوص معنی رکھتا ہے۔ یہ فارسی کا لفظ ہے اس کے معنی تابع، مطیع، غلام، خدمت گار، نوکر کے ہیں یہی وجہ ہے بندۂ خدا، بندگانِ الٰہی، اضافت کے ساتھ الگ مفہوم رکھتے ہیں۔ اگر مصرعے میں بندۂ خدا لایا جاتا تو پھر اور بات تھی۔

فقر و فاقہ، ایسے شخص کے لیے معمولی لفظ ہے جو احتیاط میں حریص نہ ہو قانع اور صبر و توکل کے تابع ہو۔ اس تناظر میں فقر و فاقہ کی جگہ بے نیازی کی صفت بہت ہی پُر معنی ہے۔ فقر و فاقہ سے بہت بلند معنی لفظ ہے اہل اللہ بے نیازی کی صفت رکھتے ہیں۔

اگر بندے کی جگہ انسان اور فقر و فاقہ کی جگہ بے نیازی ہوتا تو کیا کہنا۔

مصائب تو بہت تھے زندگی میں
قمرؔ ہم نے کبھی ہمت نہ ہاری

حرف استدراک "مگر" کے بغیر دوسرا مصرعہ مکمل نہیں "اخلال" کا سقم رکھتا ہے۔ دونوں مصرعوں کے درمیان خلا سا محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے حرف استدراک کا لانا لازمی ہے۔ اس سے نحوی اور معنوی تعلق مربوط ہو جاتا ہے۔ ذرا سے تبدیلی سے یہ اخلال ختم ہو سکتا تھا۔

مگر ہم نے کبھی ہمت نہ ہاری
قمر ہم نے مگر ہمت نہ ہاری
مگر ہم نے قمر ہمت نہ ہاری

<>

لو چراغِ وفا کی بڑھاتے رہے
ماہ و انجم کو بھی جگمگاتے رہے

پہلے مصرعے سے دوسرا مصرعہ معنوی طور پر مربوط نہیں۔ ماہ وانجم کا استعمال معنوی طور پر بے محل ہے۔ چراغِ وفا کی رعائت سے اگر ایثار کا لفظ ہوتا تو زیادہ پر معنی اور مربوط ہوتا۔ ''راہِ ایثار ہم جگمگاتے رہے''

میں ڈھونڈنے جاؤں تو کہاں جاؤں کہ اب تو
دھندلا سے گئے منزلِ رفتہ کے نشاں بھی

مصرعہ اولیٰ میں جب ڈھونڈنے جاؤں کہا ہے تو، دھندلا گئے لکھنا مفہوم کو پوری طرح واضح نہیں کرتا۔ ڈھونڈنے کے لے کسی چیز کا کھو جانا یا گم ہو جانا ضروری ہے۔ ''دھندلا سا گئے'' جملے سے معنویت میں جھول آجاتا ہے۔ جو سرسری نظر سے نہیں غور سے پڑھنے پر سمجھ میں آئے گا۔

اے قمر! صبح جانے ہو کہ نہ ہو
صبح کا، کون انتظار کرے

مصرعۂ اولیٰ میں جملہ صبح جانے سے یہ مطلب ذہن میں پہلے آتا ہے۔ صبح ہی کو یہ معلوم ہے یا ہو کہ نہ ہو کا جملہ بے تعلق ہو جاتا تعقیب لفظی ہے۔ دراصل لفظ جانے کو لفظ صبح سے پہلے آنا چاہیے تو معنوی طور پر وضاحت ہو جاتی ہے۔ شاعر کا مطلب ہے۔ خبر نہیں صبح ہو کہ نہ ہو اس لیے صبح کا پھر انتظار کون کرے۔ اس لیے لکھنا چاہیے تھا۔ ''اے قمر، جانے صبح ہو کہ نہ ہو'' تعقیب لفظی سے ذہن معنی سمجھنے کے لیے رکتا ہے۔ جانے کا لفظ متکلم کے لیے ہے اس لیے اسے پہلے ہی آنا چاہیے تھا۔ یا پھر مصرعے کے بالکل شروع میں جانے کا لفظ ہوتا۔ جانے کے معنی خبر نہیں یا ''کیا خبر'' کے ہیں۔

نظر میں جو ہمیشہ دوسروں کے عیب رکھتا ہو
اگر بھولے سے وہ آئینہ دیکھے تو ڈر جائے

شعر اچھا ہے، مگر لفظ ہمیشہ کو نظر سے پہلے لاتا تھا۔ یعنی ہمیشہ جو نظر میں لکھنا تھا تا کہ معمولی سی جو تعقیب آگئی ہے وہ نکل جاتی۔ جہاں تک ممکن ہو تعقیب لفظی سے بچے روانی شعر میں اور معنوی اعتبار سے الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر آسانی سے تعقیب نکل سکتی ہے تو ضرور اس کا خیال رکھنا چاہیے ۔

یہ خدا جانے ہے کس کی دسترس میں زندگی
ایسا لگتا ہے کہ گزرے گی قفس میں زندگی

تعقیب لفظی ہے۔ یہ خدا جانے ہے کس کی دسترس میں زندگی ۔ ذرا سی تقدیم وتاخیر سے تعقیب کے بوجھل پن میں کمی آسکتی تھی۔ مکمل طور پر تعقیب کا عیب نہیں نکلے گا مگر حرف اشارہ "یہ" پہلے اور "ہے" حرف اشارہ کی جگہ لانے سے ذرا روانی زیادہ ہو جائے گی ۔

لہو کتنا ہوا ہے صرف ان کا کون پوچھے گا
مکاں تو ہو گیا تعمیر معماروں پہ کیا گزری

ضمیر غائب بہت دور جا پڑی ہے۔ تعقیب آگئی ہے۔ تقدیم وتاخیر سے تعقیب کے جھول میں کمی آسکتی تھی مثلاً "لہو ان کا ہوا ہے صرف کتنا کون پوچھے گا" ۔

اسی سے تو خود آگاہی ملی ہے
میں واقف ہوں مزاج گمرہی سے

خود آگاہی کا تعلق عقیدے کی درستی کے بعد شروع ہوتا ہے اور گمراہی کا تعلق ایمان وعقیدے میں خلل یا، صحیح عقیدے کی راہ سے بھٹکا ہوا ہوتا ہے۔ گمراہی، خراب عقیدوں اور بُرے خیالات کے امتزاج سے وجود میں آتی ہے، وہ خود تابع ہے اقوال وکردار ذمیمہ کی۔ اس لیے اس کا مزاج نہیں۔ جس انسانی زندگی میں اخلاط کے توازن کو مزاج کا نام دیا گیا ہے، بالکل اسی طرح خراب عقیدوں اور خیالات کی غیر متوازن کیفیت گمراہی ہے۔ اس لیے خود آگاہی کے حصول کے لیے گمرہی بے محل ہے ۔

کسی سے کیا کروں ، شکوہ چبھن کا

یہ کانٹے میں نے خود بوئے ہوئے ہیں

مصرعۂ اولیٰ کے شروع ہی میں ''ذم'' کا جملہ رکھا ہوا ہے۔ لفظوں کی تقدیم وتاخیر سے اور کروں کو حذف کر کے یہ سقم نکالا جا سکتا تھا۔ بوئے ہوئے کے ساتھ میں نے کا محل نہیں ہے۔ اس جگہ میرے، لکھنا تھا۔ میں خود بوئے ہوئے ہیں روزمرہ کے خلاف ہے۔'' یہ کانٹے خود مرے بوئے ہوئے ہیں'' درست جملہ ہے۔ کسی سے کیا کروں کی جگہ'' کسی سے شکوہ کیا کیجئے چبھن کا''

یہ کتاب میری پڑھی ہوئی ہے۔ یہ پودا میرا لگایا ہوا ہے۔ یہ پھول میرا توڑا ہوا ہے۔ وہ گھر میرا بنوایا ہوا ہے۔ یہ شعر میرا کہا ہوا ہے۔

میں نے، کے ساتھ تھا ہوں نہیں لکھتے۔ مثلاً یہ کتاب میں پڑھی ہے۔ یہ پودا میں لگایا ہے۔ وہ بیج میں نے بوئے ہیں۔ یہ پھول میں نے توڑا ہے۔ یہ گھر میں نے بنایا ہے۔ فعل لازم اور فعل متعدی ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے۔ مصرعۂ مذکورہ میں فعل لازم ہی لانا تھا اور وہ اپنی درست شکل میں رکھتا ہے۔

شہر میں ایسے بھی ہیں جو
گھر سمجھتے ہیں قید خانے کو

مصرعۂ اولیٰ کے آخری رکن میں کاف کا بیانیہ ''کہ'' اور حرف صلہ ''جو'' دوسرے مصرعے میں آنا چاہیے تھے۔ پہلے مصرعے میں دوسرے مصرعے کے الفاظ لانا عجز بیان سے اساتذہ نے اسے نقص قرار دیا ہے۔

اس جستجو میں، میں نے خود کو بھی کھو دیا
اپنے بہت ملے، کوئی میرا نہیں ملا

اپنا اور میرا دونوں ہی حرف اضافت میں اور ان سے ملکیت کا تصور ملتا ہے میری کتاب، اپنی کتاب، دونوں کے ایک معنی ہیں کچھ لوگ اپنے، میں تصور ملکیت کی، کمی محسوس کرتے ہیں اور لفظ میرا میں ملکیت کے تصور کو مکمل جانتے ہیں۔ یہ محض غلط ہے۔ قواعد اردو میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ آج کل اردو میں نئی اختراع دیکھنے میں آتی ہے۔ مثلاً
میرا اپنا گھر، میرا اپنا شہر، میرا اپنا بیٹا، میری اپنی کتاب، میری اپنی تصویر، میرے اپنے لوگ،

میرے اپنے بھائی، میرے اپنے شعر وغیرہ یا خود اپنا دل، خود اپنی غلطی، خود اپنی مرضی، خود اپنی روش، قواعد اردو کی رو سے اگر چہ خود اپنا اور میرا اپنا میں معنوی مماثلث اور مرادفت کا ٹکراؤ نظر آتا ہے مگر اب یہ اتنا عام ہے کہ غلط الکلام فصیح کے زمرے میں آ گئے ہیں۔ اپنا، اپنے، اپنی، میرا، میرے، میری، ہمارا، ہمارے، ہماری، تیرا، تیرے، تیری، تمہارا، تمہارے، تمہاری سب حرف اضافت جن سے تملکی تصور اُبھرتا ہے۔ اب اگر پہلے میرا لکھا جائے تو یہ بطور ضمیر ہوگا اور اپنا اس کے ساتھ خاص ملکیت کا خیال بہم پہنچاتا ہے اس لیے جائز ہے۔ زبان کو بہر حال معنوی اعتبار سے وسعت دینا چاہیے۔ مگر بہت سے پرانے خیال کے مقلد لفظی بحث چھیڑ کر اسے قواعد کے خلاف ہی مانتے ہیں۔ لیکن میں اس روایت کو بے جا روش سمجھتا ہوں۔ میرا تصور ملکیت بھی دیتا ہے۔ میرا، اور اپنا کے استعمال میں روزمرہ محاورہ پر دار و مدار ہے، زبان جامد نہیں ہے۔ الفاظ سے نئے مفہوم اور مطالب پیدا بھی کیے جاتے ہیں اور متروک بھی کیے جاتے ہیں۔ روزمرہ محاورے میں بعض اوقات قواعد کے خلاف عمل ہوتا ہے صرف روزمرہ محاروں سے سند لی جاتی ہے۔

ملنے کے لیے یوں تو سب اپنے ملے لیکن
دنیا میں قمر میرا ، اپنا نہ ملا کوئی

اس شعر میں میرا کے بجائے اپنا سے خصوصیت اور ملکیت کامل کا تصور دیا ہے جبکہ اس سے پہلے جو شعر تھا اس میں اپنا کے بجائے میرا سے خصوصیت ظاہر کی ہے۔ اسی کا نام روزمرہ ہے۔

کہیں سازش نہ ہو مقدر کی
آج وہ مہربان سے گزرے

مقدر روز ازل ایک مرتبہ لکھ دیا گیا ہے۔ اسی کے مطابق عمل ہوتا رہتا ہے۔ تقدیر یعنی مقدر ''قضائے مبرم'' اٹل فیصلۂ الٰہی ہے۔ اس لیے سازش کا لفظ بے محل ہے۔ مقدر مفعول ہے وہ فاعل نہیں جو سازش کرے گا، اگر سازش کو امر اتفاقی کے مفہوم میں لیا جائے تو مقدر کو امر اتفاقی میں بھی دخل نہیں۔ سازش کی جگہ اگر لفظ لکھا آتا یعنی کہیں لکھا نہ ہو، جملہ ہوتا تو مفہوم کا یہ سقم دور ہو جاتا۔ سازش کے لفظ سے مقدر کی اہمیت گھٹ جاتی ہے اور ''مقدر'' یعنی تقدیر لکھنے والے کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ لفظ سازش کے لغوی و اصطلاحی معنی پہنچانے

میں مددگار نہیں ہیں ۔ لفظ "سازش" کے اردو معنی تو شعر کے مفہوم کو مزید معنوی سقم سے پُر کر دیتے ہیں ۔

اُس پہ کھلتا ہے زندگی کیا ہے
جو یقین و گمان سے گزرے

یقین و گمان کا عالم گومگو یعنی مطلق تذبذب کا عالم ہے اور تذبذب میں لکھی کسی چیز کی حقیقت واضح نہیں ہو پاتی ۔ یہاں یا تو صرف یقین کا ہی لفظ آتا یا پھر گمان کا لفظ آتا تو معنی درست ہو جاتے دونوں کا ایک ساتھ ہونا نہ یقین ہے نہ گمان ۔ اس لیے زندگی کی حقیقت کس طرح کھل سکتی ہے ۔ مضمون تشنہ ہے ۔ زبردستی معنی نہیں پہنائے جاسکتے ۔ یقین کے ساتھ گمان، عالم غیر یقینی ہے یا پھر یہ کہا جاتا ۔ وہ جو وہم و گمان سے گزرے ۔ وہم و گمان خود یقین کی طرف لاتا ہے ۔

مجھے کچھ بھی نہ دے اے میرے مالک
شعور علم و حکمت چاہتا ہوں

مجھے کچھ بھی نہ دے، کہہ کر شعور علم و حکمت کی طلب بے معنی ہے ۔ مضمون تو فی البطن شاعر رہ گیا ہے مطلب یہ تھا کہ میرے مالک اور کچھ بھی نہ دے، مگر میں صرف علم و حکمت کی طلب رکھتا ہوں ۔ مجھے کچھ بھی نہ دے مطلق نفی ہے کسی اور چیز کی ۔ اس لیے، میرے مالک نہ دے کچھ اور مجھ کو کہہ کر طلب نفی کو ختم کیا جاسکتا تھا اور حصول علم و حکمت کے شعور کا استعمال صحیح ہو جاتی ۔

مرا مسلک تو درویشی رہا ہے
میں کب دنیا کی دولت چاہتا ہوں

مرا مسلک درویشی رہا ہے، یعنی اب نہیں ہے پہلے تھا ۔ درویشی کا خاصہ جاری تھا یعنی ناتمام تھا ۔ ماضی استمراری ناتمام عمل کے لیے ہے شاعر کا مطلب تو یہ ہے کہ ...... میرا مسلک درویشی ہے، اس لیے مجھے دولت دنیا کی طلب نہیں ہے ۔ بظاہر شعر معنوی اعتبار سے درست معلوم ہوتا ہے مگر جب معنی پر حرفی اعتبار سے غور کریں تو مفہوم یہی ہوگا ۔ کہ میرا مسلک درویشی رہا ہے اب نہیں ۔ مصرعۂ اولیٰ میں فعل حال لانے سے پہلے مفہوم زیادہ واضح ہو جاتا

اور استمراری فعل سے جو معنوی بعد پیدا ہو گیا ہے وہ ختم ہو جاتا۔ روز مرہ فعل حال ہی ہے۔ اور استمراری کے ساتھ لانا غیر روز مرہ ہے۔ شعر غلط نہیں مگر کمزور ضرور ہے۔ سست بندش میں شمار ہوگا۔

زمانے کی نگاہوں میں جو محتاج توجہ ہیں
ہمارے حال پہ ان کا کرم ہوگا تو کیا ہوگا

اگر کوئی لفظ پورا وزن میں آ رہا ہو تو، اسے پورا ہی لکھنا بہتر ہے۔ یعنی پہ کی جگہ پر زیادہ فصیح ہے۔

پیاس، جانے کیوں نہیں بجھتی کسی کی آج تک
جبکہ، ہے پانی سفر میں تشنگی کے ساتھ ساتھ

اردو روز مرہ محاورے میں ایک ساتھ کے بعد دوسرا ساتھ لانا زور پیدا کر کے لیے بولا جاتا ہے۔ حالانکہ مطلب ایک ہی ساتھ کے بعد پورا ہو جاتا ہے، ساتھ، شرکت اور شریک کے اظہار کے لیے ہے۔ جس میں تواتر بھی شامل ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں بجھتی کے بعد آج تک کہنا غلط ہے۔ نہایت کمزور بندش ہے۔ ہاں اگر بجھتی کے بجائے بجھی، کہا جاتا تو آج تک کا استعمال بے محل نہیں رہتا۔ یا ''بجھ پائی'' لکھا جاتا، تو بھی آج تک لکھنا برمحل تھا، اس لیے کہ بجھی یا بجھ پائی تو ماضی ہیں جبکہ آج تک، زمانہ حاضر، کے لیے ہے یعنی گذشتہ کل سے آج تک کا استعمال قواعد کے خلاف بھی ہے اور روز مرہ محاورے کے برعکس بھی۔ لفظوں کی ذرا سی تقدیم و تاخیر سے شعر اس طرح ہوتا تو مذکورہ نقص باقی نہیں رہتا۔ غور کیجیے!

پیاس جانے کیوں نہ بجھ پائی کسی کی آج تک
جبکہ پانی تھا سفر میں تشنگی کے ساتھ ساتھ

پیاس جانے کیوں نہ بجھ پائی کسی کے ساتھ ساتھ
جبکہ پانی تھا سفر میں تشنگی کے ساتھ ساتھ

یا

پیاس جانے کیوں نہیں بجھتی کسی کے ساتھ ساتھ
جبکہ پانی ہے سفر میں تشنگی کے ساتھ ساتھ

اگر خیال کو زمانہ ماضی میں بیان کرنا ہو تو شعر نمبر ایک یا مطلع نمبر ۲ درست ہوگا اور زمانہ حال میں بیان کرنا ہو تو مطلع نمبر ۳ درست ہوگا مندرجہ بالا مشوروں سے مراد یہ نہ لی جائے کہ اصلاح ہے بلکہ تنقیدی بیان کی وضاحت کے لیے ہے۔ بغیر امثلہ کی وضاحت ممکن نہیں۔

لاکھ چاہے پردۂ شب میں رہے
روشنی تو روشنی کہلائے گی

غزل بہت نازک صنفِ سخن ہے اس کے لیے بوجھل لفظ مناسب نہیں، مصرعۂ اولیٰ میں، لاکھ چاہے، کا جملہ کچھ زیادہ عمدہ محسوس نہیں ہوتا۔ شعر بے عیب ہے اگر ذرا سی ترمیم کے بعد یہ ہو جائے یعنی لاکھ چاہے کہ، بجائے" چاہے وہ کتنے ہی پردوں میں رہے" کہہ کر، لاکھ چاہے، سے جو بوجھل پن ہے ختم کیا جاسکتا تھا۔ پوری غزل عمدہ ہے۔

برائے خیر مقدم آئے ہر آفت زمانے کی
میں بنیادیں قفس میں رکھ رہا ہوں آشیانے کی

خیر مقدم (استقبال) کا استعمال درست نہیں، خیر مقدم تو اظہارِ خوشی کے لیے ہوتا ہے۔ آفت کی رعایت سے جملہ لانا چاہیے تھا۔ کسی ایک مکان کی بنیاد ایک ہی ہوتی ہے جمع کا لفظ بنیادیں مناسب نہیں۔ واحد لفظ بنیاد آنا تھا۔

حوصلہ ہو تو حادثہ کوئی
توڑ کر مجھ چٹان سے گزرے

مصرعۂ اولیٰ میں چٹان سے" کی جگہ علامتِ مفعول" کو" کے ساتھ چٹان کا استعمال زیادہ فصیح ہے۔ توڑ کر مجھ چٹان کو گزرے
مگر سے ردیف کا حصہ ہے اس لیے شاعر مجبور ہوئے۔ بہر حال ست بندش ہے۔

اُس کی خوشبو سے مہک جائے میری تنہائی

مصرعے کے آخر میں، میری تنہا سے تعقل پیدا ہو رہا ہے، اگر یہ میری تنہائی ہوتا تو تعقل ختم ہو جاتا۔ یا پھر یہ میری تنہائی آ جاتا۔ شاید کتابت میں یہ لکھنے سے رہ گیا ہے۔

ملنے کے لیے یوں تو سب اپنے ملے، لیکن
دنیا میں قمرؔ میرا اپنا نہ ملا کوئی

جملہ میرا اپنا، کا استعمال جدید اردو میں کثرت سے استعمال ہو رہا ہے پہلے مصرعے میں "سب اپنے ملے" کہا ہے اور دوسرے مصرعے میں میرا اپنا کہا ہے، سوائے جمع اور واحد کے کوئی فرق نہیں۔ شاعر کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ملنے کو تو دنیا میں بہت سے لوگ ملے، مگر اپنا کوئی نہیں جس سے دل کی راہ تھی۔ یا پھر یہ کہنا چاہتے ہیں اپنوں میں وہ خاص اپنا نہیں ملا جس کو دل چاہتا ہے۔ سب اپنے میرا اپنا لفظی گورکھ دھندہ ہے اس میں شاعری نہیں۔ میرا اپنا کی بحث گزشتہ سطور میں کر چکا ہوں۔ پہلے مصرعے میں ملنے کے لیے کی جگہ ملنے کو تو سب ملے ہونا چاہیے تھا۔ ملنے کے لیے روزمرہ کے خلاف ہی نہیں قواعد اردو کے خلاف بھی ہے۔

جب کاتب فطرت نے کچھ سوچ کے لکھا ہو
کس طرح مٹا دے گا قسمت کا لکھا کوئی

کاتب فطرت کے بجائے کاتب قسمت ہی زبانِ فصیح ہے اور کاتب قسمت یا فطرت سے مراد، رب عالم ہے اس کا کام سوچنا نہیں۔ اس کے علم میں پہلے سے سب کچھ ہوتا ہے، سوچنا انسانی فعل ہے جو نفع اور نقصان اور خیر و شر سے ناواقف ہے۔ مصرعۂ اول بدل جاتا تو بہتر تھا۔ شاعر صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں۔ لکھا ہو قسمت کا جب عین مشیت ہو۔ کس طرح مٹا دے پھر قسمت کا لکھا کوئی۔ معنوی اعتبار سے تقدیر الٰہی کے مبرم ہونے پر تمام شعرا نے کچھ نہ کچھ کہا ہے لیکن یگانہ چنگیزی کا شعر بہت عمدہ ہے ؎

تبدیل کی مجال نہیں ہے تو کیا ضرور
بے ربطیِ نوشتۂ تقدیر دیکھنا

❖❖❖

اے قمرؔ اس وقت اک مجرم سا بن جاتا ہوں میں
کر کے نیکی جب بُرائی سامنے آ جائے ہے

کر کے فعل ہے اگر نیکی کے بعد میں آتا تو تعقیب کا نقص بھی نکل جاتا، ذم کا تصور بھی باقی نہیں رہتا۔ شعر کا مفہوم اچھا ہے نیکی کا بدلہ بُرائی سے ملنا کے مضمون پر سادگی سے اظہار ہے۔

اس طرح سے روز و شب میں نے گزارے ہیں کبھی
آپ کی یادوں سے اپنے دل کو بہلاتا رہا

اس طرح سے لکھنا پرانے اساتذہ نے متروک کر دیا تھا، کیونکہ طرح خود حرف تشبیہ ہے اور سے بھی بطور حرف تشبیہ استعمال ہوتا ہے اس لیئے اساتذۂ قدیم و متوسط نے لکھنا ممنوع قرار دیا تھا، مگر اس پر عمل نہیں ہوا اور آج کل بھی لکھتے ہیں اس لیے جائز قرار دینا ہی مناسب ہے حالانکہ معنوی نقص ہے۔ مستند اور محتاط شعرا اب بھی گریز کرتے ہیں طرح کے ساتھ سے کا استعمال۔ مناسب نہیں۔ لیکن راقم الحروف کے خیال میں اسے جائز کر لینا توسیع زبان میں شامل ہوگا۔ جن متقدمین کو متروک کرنے کا اختیار تھا سو جودہ دور میں شعرا کو اردو زبان کو وسعت کے پیش نظر لکھنا درست ہوگا۔ زبان جامد شے نہیں ہے۔

یہ سوچ لے، کہ ترا حسن نا مکمل ہے
بہت حسین سہی تو مری نظر کے بغیر

شاعر کہنا چاہتے ہیں، اے مرے محبوب تو میری نظر کے بغیر بہت خوبصورت ہے مگر یہ جان لے تیرا حسن مکمل نہیں۔ ''حسن نا مکمل ہے'' کہا گیا ہے، اس لیے جان لے ہونا چاہیے۔ سوچ لے نہیں۔ سوچنا محبوب کا ذاتی عمل ہے اور وہ خود اپنی سوچ کے مطابق مکمل حسن کا مل ہے۔ جان لے دوسرے کی بتائی ہوئی بات ہے اس لیے سوچ یہاں کمزور لفظ ہے۔ سست بندش ہے۔

مری قسمت یہ آخر کون سی منزل میں لے آئی
کہ ہر لمحہ مسلسل ہو رہا ہے رائیگاں میرا

منزل میں بجائے منزل پہ ہونا صحیح ہے منزل میں، لکھنا غلط ہے، کاف بیانیہ ''کہ'' مصرعے کے شروع میں لانا غیر فصیح ہے اساتذہ نے پرہیز کیا ہے۔ ہر اک لمحہ لکھ کر یہ سقم دور ہو جاتا ہے۔

قمر سونپی تھی جن کو لالہ و گل کی نگہبانی
انہیں ہاتھوں نے لوٹا ہے ہمیشہ گلستاں میرا

نگہبانی کا عمل یا کوئی کام ہاتھوں کو نہیں ہاتھ والوں کو سونپا جاتا ہے۔ اس لیے ہاتھوں کے

بجائے لوگوں ہونا چاہیے تھا۔ مصرعۂ اولیٰ میں جن کو لکھا گیا ہے جو ضمیر شخصی کے لیے ہوتا ہے ہاں اگر یہ لکھا جاتا انہی لوگوں کے ہاتھوں نے گلستاں لوٹا تو درست ہو جاتا اور نقص باقی نہیں رہتا۔

توڑ کر دیوار باہر آ نہ جائے
ایک طوفاں جو پسِ دیوار ہے

جب طوفان پسِ دیوار ہے یعنی مکان کی دیوار پیچھے تو وہ دیوار توڑے گا تو اندر آئے گا۔ باہر آ نہ جائے سے تو مطلب ہی شعر کا خبط ہو جاتا ہے۔ شاید شاعر صاحب سے سہو ہوا ہے وہ اندر کے بجائے باہر لکھ گئے ہیں۔

جس سے پوشیدہ ہے رہزن کا مزاج
آج تک وہ قافلہ سالار ہے

مزاج کمزور لفظ ہے رہزن کی خاصیت کی پوری طرح عکاسی نہیں کرتا۔ مزاج کے بجائے فطرت، عادت، خاصیت، سرشت یا خو ہونا چاہیے۔ مزاج کے اصطلاحی معنی اگرچہ مذکورہ الفاظ سے بھی تعبیر کے لیے جاتے ہیں مگر وہ درست نہیں مزاج کا درست مفہوم طبیعت سے پورا ہوتا ہے مزاج انسانی کی اخلاط کی آمیزش کے توازن کو کہتے ہیں۔ کبھی یہ نہیں بولتے اس کا مزاج خراب بلکہ کہتے ہیں اس کی طبیعت خراب، مزاج اخلاق کی خرابی کے لیے بولتے ہیں۔ لفظوں کے لطیف سے فرق سے معنویت متاثر ہوتی ہے۔ بول چال میں، شیطان فطرت، کہتے ہیں شیطان مزاج نہیں کہتے۔ صفات اخلاق میں خلل کو، بدمزاج کہتے ہیں۔ اس لیے رہزن کا مزاج لکھنا درست معلوم نہیں ہوتا۔

جگمگانے لگے تقدیر قمر کی یارب
کوئی ایسی بھی کبھی رات سہانی دیدے

کوئی کے بجائے کبھی اور کبھی کی جگہ کوئی کا محل ہے۔ شروع میں کوئی کے آنے سے کسی کی طرف اشارہ ہو جائے گا لیکن بعد میں کوئی آنے سے اشاریت کسی انسان کی طرف ختم ہو جاتی ہے، کیونکہ سہانی رات خدا سے مانگی جارہی ہے۔ مصرعۂ اولیٰ کے آخر میں رب سے تخاطب ہے۔ اس لیے کوئی بعد میں ہی آنا زیادہ پُر معنی اور فصیح ہوگا۔

سیف الرحمان گرامی، قمر جمالی، رؤف صدیقی نعتیہ مجموعے کی تقریب پذیرائی کے موقع پر

ساقی امروہوی، اطہر شاہ خان جیدی، ہوش امروہوی، شبنم صدیقی، نگار فاروقی قمر جمالی

دو گھڑی آ کے آپ بیٹھیں تو!
ہم بھی ہیں سایۂ شجر کی طرح

مصرعۂ اولی میں لازمی تھا کہ میرے پاس یا میرے قریب لایا جاتا۔شاعر نے جو ضمیر اپنے لیے "ہم بھی" استعمال کی ہے اس کی وضاحت ہو جاتی، شعر میں اس قسم کا لفظ حذف کرنا جو کسی بات کو واضح ہے سو جو نہ ہو تو معائب سخن میں شمار ہے اس کا "اخلال" ہے دو گھڑی میرے پاس بھی بیٹھو، میں بھی ہوں سایۂ شجر کی طرح اور تعقیب کو بھی درست کیا جا سکتا تھا یعنی آ کے بعد میں آتا اور ضمیر آپ پہلے آتی۔ آ کے بیٹھیں کی اتنی ضرورت نہیں جتنی پاس و قریب کے الفاظ کی ضرورت ہے۔

کوئی بھی میرا غم گسار نہ تھا
میں نے ہر غم کو غم گسار کیا

شاعر کا مطلب ہے میرا غم گسار کوئی بھی نہ تھا اس لیے میں خود اپنے غم گسار (غمخوار) بنا لیا۔ معنوی اعتبار سے شعر واضح نہیں بیان الجھا ہوا ہے۔ اگر اسے یوں کہتے۔

نہ ملا غم گسار جب کوئی
اپنے ہی غم کو غمگسار کیا

یا

غم کو خود اپنے غم گسار کیا

جو اخلال کا سقم تھا دور ہو گیا۔

☆☆☆

پروفیسر سحر انصاری

اوجِ قمر

شاعری انسانی محسوسات کے اظہار کا لطیف ترین پیرایہ ہے۔ انسانی محسوسات میں جس قدر تنوع ہوگا، شاعری میں بھی اسالیب کے نئے نئے رُخ پیدا ہوں گے۔

پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک یا چند ایک شاعر ہی سارے انسانی محسوسات کا اس طرح احاطہ کرلیں کہ دوسروں کے لئے گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ اس لئے تاریخ ادب و شعر ہمیں بتاتی ہے کہ کسی عہد کا عظیم سے عظیم شاعر بھی تن تنہا اپنے پورے عہد کو اس کی تمام تر جزئیات کے ساتھ اپنی شاعری میں نہیں سمیٹ سکتا ہے۔ ہر دور میں ہر انداز اور ہر مرتبے کے لکھنے والوں کی گنجائش اور ضرورت باقی رہتی ہے۔ پورے دور کا مطالعہ کرنا ہو تو اس کے تمام قابلِ ذکر شعرا کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے۔

ہمارا عہد جسے ہم قیامِ پاکستان ہی سے تعبیر کریں اور گزشتہ نصف صدی کے حوالے سے اُسے دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ اس میں چند موضوعات تو بار بار دہرائے گئے ہیں اور بعض اپنے ماہ و سال کے مخصوص حالات کی نسبت سے اُبھرے ہیں۔ جن موضوعات و مضامین کو تواتر کے ساتھ بالخصوص اُن شعرا کے یہاں دیکھتے ہیں جو ہجرت کر کے اس سر زمین پر آئے ہیں تو ان کے اشعار یادِ ماضی، ہجرت کے تجربے اور نئی فضاؤں سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی کاوشوں سے معمور نظر آتے ہیں۔

قمر جمالی بھی اپنے ہم سنوں اور معاصروں کی طرح امروہے سے پاکستان آئے اقدار کی شکست وریخت اور زندگی کی دھوپ چھاؤں کو انہوں نے جس طرح انفرادی اور اجتماعی زاویوں سے دیکھا اور محسوس کیا اس کی جھلک ان کے اشعار میں دکھائی دیتی ہے۔ غزل کا ایک خاص اسلوب جس کا سب سے زیادہ نکھرا ہوا رنگ جگر مرادآبادی کے یہاں نظر آتا ہے گزشتہ نصف صدی کے دوران متعدد شعرا کا پسندیدہ اسلوب رہا ہے۔ اس میں غزل کی کلاسیکی روایات کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے جدید زندگی کے مسائل و تجربات کو بھی مانوس استعاروں میں بیان کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔

قمر جمالی کی شعری کاوشیں اسی فضا کی پروردہ ہیں۔

زندگی میں انسان کو سماجی رشتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس سفر کے دوران محبت، نفرت، خلوص، مسابقت، بہار و خزاں، محفل اور تنہائی، ایثار و خودغرضی، فنا و بقا، غلامی اور بغاوت، وفا اور بے وفائی، بے بسی اور بلند حوصلگی، تمول اور تنگدستی، گھٹن اور آزادی، اذیت اور آسودگی کے بے شمار اور متضاد تجربات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

قمر جمالی ان تجربات سے متر انہیں چنانچہ ان کا عکس ان کے پورے کلام میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ قمر جمالی انسان اور انسانی معاشرے کے بارے میں اپنے کچھ تصورات رکھتے ہیں۔

ن۔م۔راشد نے امریکی نیگرو لیڈر مارٹن لوتھر کنگ کا ہم نوا بن کر کہا تھا۔

"میرے بھی ہیں کچھ خواب"

ان الفاظ میں معلوم نہیں کس کس کی ترجمانی ہو رہی ہے۔ قمر جمالی کے بھی کچھ خواب تھے اور ہیں۔ ان خوابوں کی تعبیر تلاش کرنے کے لیے انہوں نے سیاست میں بھی عملی حصہ لیا اور معاشرے کی تعمیر و ترقی کے لئے ایک عملی انسان کی حیثیت سے سرگرم ہو گئے۔ شاعری نے جب میدان عمل میں قدم رکھ دیا تو اس کے تقاضے بدل گئے۔

یہ سفر اور جدوجہد جاری تھی کہ ایک مرحلے پر قمر جمالی کی رفیقہ حیات بہ رضائے الٰہی قمر جمالی کا ساتھ چھوڑ گئیں۔ اب ان پر بچوں کی پرورش اور اپنی اکیلے پن کی ادھوری زندگی کی ذمہ داری آن پڑی۔ قمر جمالی نے نہایت حوصلہ مندی اور پامردی سے حالات کا

مقابلہ کیا۔ گھر بار کو ایک ذمے دار انسان کی حیثیت سے قابلِ ذکر بنا دیا ذاتی کاروبار میں ترقی کی اور زندگی کے داخلی اور خارجی معاملات کے اظہار کے لئے غزل کا سہارا قائم رکھا ایسے شخص کی زندگی جب شاعری میں پیرایۂ اظہار تلاش کرے تو کیفیت وہی جاتی ہے "از دل خیزد، بر دل ریزد" قمر جمالی کے چند اشعار دیکھئے ۔

میں دنیا سے محبت چاہتا ہوں
وقارِ آدمیت چاہتا ہوں
سخن میں دل لہو کرتا ہوں اپنا
میں کب دنیا سے قیمت چاہتا ہوں

❖❖

چمن پر کیا ہمارا حق نہیں ہے اے چمن والو
جلائے جائیں گے آخر ہمارے آشیاں کب تک

❖❖

ہم نے جو ایک لمحہ گزارا تھا پیار کا
حاصل نہ کر سکے اُسے صدیاں گزار کے

❖❖

نشیمن ہی نہیں ہم بھی جلیں گے آگ برسے گی
ہمیں معلوم ہے اب کے بہار آنے پہ کیا ہوگا

❖❖

عہدِ ماضی کے رفیقوں کو تو کیا پہچانتے
آئینے میں اپنی صورت تک نہ پہچانی گئی

❖❖

میں ترے شہر میں کیسے کسی سے گفتگو کرتا
نہ کوئی ہم سخن میرا نہ کوئی ہمزباں میرا

❖❖

وہ شے ناپید ہے دنیا میں شاید
زمانہ جس کی حسرت کر رہا ہے

ہوا ہے ہم کو یہ موجوں کی طغیانی سے اندازہ
حوادث کی حقیقت ڈوب کر معلوم ہوتی ہے

قمر اس عہد نو کے جو تقاضوں کو نہیں سمجھے
انہیں تصویرِ مستقبل کی دکھلانے سے کیا ہوگا

ان اشعار میں قمر جمالی کے ذہنی، قلبی اور سماجی پس منظر کی شاعرانہ جھلک دیکھی جا سکتی ہے جن کا میں نے گزشتہ سطور میں تذکرہ کیا ہے۔ اس طرح نہ صرف ہمارے عہد کے کچھ تخلیقی عکس یکجا ہو گئے ہیں بلکہ قمر جمالی اپنے ماحول کو زندگی کے سیاہ وسفید کا ایک مرقع بھی تحفے میں دے رہے ہیں۔

قمر جمالی کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے ہم عصروں کا بھی خیال آتا رہا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا انسان کی شناخت اپنے ماحول اور اپنے ہم جلیسوں سے ہوتی ہے۔

قمر جمالی کے معاصرین میں نمایاں نام نظر امروہوی، ہوش امروہوی، ساقی امروہوی، جون ایلیا کے ہیں۔ تجرباتِ حیات کی بعض مماثلتوں کے باوجود ان سب کا اپنا اپنا اندازِ سخن ہے۔ قمر جمالی کی شاعری کی انفرادیت اسی پس منظر میں اُجاگر ہوتی ہے ان کا کلام اپنے قارئین سے یقیناً داد وصول کرے گا۔ اگرچہ قمر جمالی کا یہ پہلا شعری مجموعہ ان کی مدتِ شعر گوئی کی مناسبت سے خاصا تاخیر سے شائع ہو رہا ہے تاہم مجھے یقین ہے کہ ادبی حلقوں میں اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

☆☆☆

ڈاکٹر خیالؔ امروہوی

''قمر جمالی کی شاعری نئی نسل کے لئے چراغِ راہ ہے''

''صحرا میں شجر'' کی شاعری داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر کی شاعری ہے۔ ہجرت زدہ کا احساس شعلہ جوالہ ہوتا ہے میں اسے خالص ناسٹلجیا بھی نہیں کہتا کیونکہ ''صحرا میں شجر'' کی شاعری محض ترکِ وطن کی شاعری نہیں بلکہ ایک ایسا وطن نہ ہونے کی فریاد یا استغاثہ ہے جس کا شاید تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ہمارا یہ احساس بھی بیحد معصومانہ ہے جبکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ آئیڈیل وطن نہیں بلکہ تجرباتی مستقر کی حیثیت سے ''قہر درویش بر جان درویش'' کے طور پر نمودار ہوگیا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو عیار و چالاک بلکہ عاقبت اندیش ہزاروں افراد اربوں ڈالر سمیٹ کر یہاں سے چلے نہ گئے ہوتے۔ معلوم ہوا کہ جنہیں یقین نہیں تھا وہ آرام سے رہے جنہیں اس سرزمین پر یقین تھا وہ آج تک مارے مارے پھر رہے ہیں۔

اس ارضِ بے بنیاد پر وطنِ ثانی کی صورت یقین رکھنے والوں، محبت اور جان نثاری کے جذبات رکھنے والوں میں، میں بھی شامل ہوں لیکن ۵۳ برس گزارنے کے بعد معلوم ہوا کہ ایں خیال است ومحال است وجنوں۔

''صحرا میں شجر'' کے اکثر اشعار بیحد پسند آئے کیونکہ ان اشعار کی معنویت میں ایک ایسی حقیقت مضمر ہے جسے اہلِ دردہی سمجھ سکتے ہیں۔

تو نے ڈھالا تھا جسے دستِ ہنر سے پہلے
بے گھری اس کا مقدر ہوئی گھر سے پہلے

◆◆

جانے کس کس کے نام آئیگے
طول مت دیجئے فسانے کو

◆◆

ایک ہجرت نے تو صدیوں کا سفر روک دیا
دیس سے اب کے بھی کیا دیس نکالا ہو گا؟

◆◆

ہم نے جو معرکۂ شام و سحر دیکھا ہے
کیا کبھی تم نے بھی اے اہلِ نظر دیکھا ہے

◆◆

لاکھ مخفی پردۂ شب میں رہے
روشنی تو روشنی کہلائے گی

◆◆

شام کو جب کوئی طائر لوٹ کے گھر جائے ہے
مجھ کو بھی اس وقت اپنا آشیاں یاد آئے ہے

◆◆

ایک لمحے کو تو ماضی کی طرف بھی پلٹوں
میری تصویر مجھے کوئی پرانی دیدے

◆◆

اک نیا انقلاب آتا ہے
لوگ جب ٹوٹ کر بکھرتے ہیں

◆◆

خدا کسی کو اگر عالم آشنائی دے
تو ہر طرف اُسے پھر روشنی دکھائی دے

یہ اُن سے پوچھئے افلاس کے ماروں پہ کیا گزری
ہوئی بارش تو اُن کی کچی دیواروں پہ کیا گزری

''صحرا میں شجر'' مجموعۂ کلام کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ قمر جمالی امروہوی صاحب دل، اہلِ فکر ونظر اور ایک استاد شاعر ہیں۔ ان کا کلام نقائص ومعایب شعری سے پاک، حسن زبان و بیان کا مرقع، دبستانِ امروہہ کی آن بان، ماضی حال اور مستقبل کا ترجمان کہلانے کے لائق ہے۔

اردو دشمنی کے اس عہد اور عصر ابتذال و جہالت میں قمر جمالی کی شاعری نئی نسل کے لئے چراغ راہ ہے۔

پروفیسر حسنین کاظمی

شخصیت اور فن

ایک بہت سادہ، بہت اچھا شعر دیکھئے ۔

جب کسی امتحان سے گزرے
ہم بڑی آن بان سے گزرے

یہ شعر قمر جمالی کا ہے اور ان کی شخصیت اور ان کی فکر وفن دونوں کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

قمر جمالی صاحب نے اپنے شعری مجموعے کے لئے بڑا دلکش اور بامعنی عنوان منتخب کیا ہے۔ "صحرا میں شجر" صحرا کو اگر طویل اور صبر آزما سفر کی علامت سمجھا جائے تو "شجر" تازگی اور نئی زندگی کی صورت نمایاں ہوتا ہے۔ اُس عنوان پر نظر پڑتے ہی مجھے اقبال کی نظموں کے چند اشعار بے ساختہ یاد آ گئے "خضرِ راہ" شروع ہی ان اشعار سے ہوتی ہے ۔

ساحلِ دریا پہ میں اِک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اِک جہانِ اضطراب

شب سکوت افزا ہوا آسودہ دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آ

یا پھر ''مسجد قرطبہ'' کا آخری بند جس کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے۔

وادیٔ کہسار میں غرق شفق ہے سحاب
لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پرسوز ہے دختر دہقاں کا گیت
کشتیٔ دل کے لئے سیل ہے عہد شباب

یا ان کی نظم ''ذوق وشوق'' کا پہلا شعر ہے۔

قلب ونظر کی زندگی، دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

''صحرا میں شجر'' کا تصور بھی ہمیں ایسے ہی حیات بخش مناظر سے قریب تر کر دیتا ہے جو فکر میں تازگی اور قوت نمو کی دلیل ہے۔

قمر جمالی صاحب کا تعلق برصغیر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی اس نسل سے ہے جو تاریخی واقعات کی صرف شاہد ہی نہیں، تاریخ سازی کے عمل میں شریک بھی رہی ہے۔ راقم الحروف بھی عمر میں قمر جمالی صاحب سے کم ہونے کے باوجود اسی تاریخ ساز نسل کا ایک فرد ہے۔ وہ نسل جس نے تحریکِ پاکستان کے دور کو دیکھا۔ یا اس میں کسی بھی حوالے سے شرکت کا اعزاز حاصل کیا۔ وہ نسل بڑی منفرد نسل ہے۔ نہ جانے کتنی نسلیں آزادی کی نورانی صبح دیکھنے کی آرزو دلوں میں لئے رخصت ہو گئیں۔ یہ وہ نسل ہے جسے طلوع صبح آزادی کا نظارہ میسّر آیا اور آزادی کے زخم بھی نصیب ہوئے۔ اس نسل نے برصغیر ہی میں نہیں، عالمگیر سطح پر جو کچھ بنتے دیکھا ہے، بگڑتے دیکھا ہے۔ جوہری بم کی تباہ کاریاں اور انسان کا خلائی سفر اور تسخیر قمر۔ کسی ایک نسل نے اتنا کچھ نہ پہلے دیکھا تھا اور نہ آئندہ شاید کوئی ایک نسل ایسے عہد ساز واقعات دیکھے گی۔ اس اعتبار سے قمر جمالی صاحب کا فن ان کی تجرباتی فکر کا آئینہ دار ہے۔

تجربات کی کیفیت سے تو سب گزرتے ہیں لیکن اس کی حقیقت کا شعور اور ادراک سب کو میسر نہیں آتا۔ اور شعور میسر آجائے تو بھی حسن اظہار کے مرحلے سے گزرنا آسان نہیں ہوتا۔ شعر نغز کو اگر سلیقۂ اظہار بنانا جائے تو پھر مرحلہ دشوار تر ہو جاتا

ہے ۔ میرؔ نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ شاعر کا دیوان دراصل درد و غم کا مجموعہ ہوتا ہے ۔

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

وہ فکر جو شعر کی صورت ڈھل کر سامنے آتی ہے وہ اکثر "بار الم" کا اور کبھی کبھی "رنگِ نشاط" کا اظہار ہوتی ہے ۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں ہمارے صاحبانِ فکر و فن جن دل گداز واقعات کے کرب مسلسل سے گزرے ، اس کے اظہار کی بازگشت نصف صدی کے سلسلۂ روز شب کے گزران سے بھی تھمی نہیں ، صرف لہجہ دھیما ہوا ہے لیکن لہجے کا دھیما پن کرب کو دھیما نہیں کرتا بلکہ ہوتا یوں ہے کہ کرب کی شدت اپنے اظہار کے لئے نرم اور دھیما انداز اختیار کر لیتی ہے ۔ خاموشی کے علاوہ احساسِ غم کی شدت کے اظہار کا یہی موثر وسیلہ ہے اور ہمارے دور میں غم کی شدت نے یہ پیرایۂ اظہار بار بار اختیار کیا ہے ۔ قمر جمالی کے فکر و فن میں دبی یہ چنگاریاں جا بجا ہمارے احساسات کو چھپکے لگاتی ہیں ۔ اس طرح ہم ان کے دل پر لگے زخموں کی گہرائی کا تھوڑا بہت اندازہ کر سکتے ہیں ۔

قمر جمالی کی فکر ، اسلوب اور پیرایۂ اظہار پر فنی زاویۂ نظر سے اظہار خیال ناقدانِ فن کا حق ہے ۔ میں نے ایک عام قاری کی حیثیت سے ان کے فن کا مطالعہ کیا ہے اور یہ سمجھا ہے کہ فن کی یہ دولت انہیں ورثے میں بھی ملی ہے اور ان کے حسی تجربات نے یہ راہ اُن پر مزید روشن کی ہے وہ فن کے ذریعے اپنے دل کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ غم میں شرکت غم کی شدت کو نرم کر دیتی ہے ۔ ان کی فکر اور ان کے فن میں ہماری تاریخ کے غالباً سب سے اہم دور کی ترجمانی کی جھلکیاں مل جائیں گی ۔ اس حوالے سے ان کے کچھ اشعار پیش کرنا چاہتا ہوں ۔

جان دیدیں گے اس چمن کے لئے
ہم نشیمن جلا کے آئے ہیں
جو ہواؤں کی رو پہ روشن ہیں
ہم نے ایسے دیئے جلائے ہیں

روشنی ہماری ضرورت ہے ، خصوصاً وہ روشنی جو محرومی اور مایوسی کے اندھیرے دور

کرنے کی آرزو کی علامت ہو۔

روشنی کچھ تو ملے کچھ تو اندھیرا کم ہو
اِک دیا ہم نے سرِ راہ جلا رکھا ہے

اس روشنی کا اہتمام اندھیروں سے نبرد آزما ہونے کی ہمت کا پتہ دیتا ہے اور ان کا یہ شعر سادگی و پرکاری کا دلکش نمونہ ہے۔

کوئی دشمن اگر نہیں تو چلو
دوستوں کو تلاش کرتے ہیں

اور یہ شعر دیکھئے جس میں نا مساعد حالات سے مسلسل برسرِ پیکار رہنے کا عزم نمایاں ہے۔

اے قمر یوں کون چلتا ہے کسی کے ساتھ ساتھ
جس طرح میں چل رہا ہوں تیرگی کے ساتھ ساتھ

فکر کا ایک اور پہلو یہ کہ ہم پر ہمارے ہی مفادات، خواہشات اور تعصبات نے جس طرح غلبہ حاصل کرلیا ہے اس غلبے کے طلسم کو توڑنا قومی تعمیر کا اولین تقاضا ہے لیکن ابھی ہم اس کی گرفت سے نکلے نہیں ہیں۔ اس کیفیت کا برملا اظہار یوں ہوا ہے۔

نفرت کی آندھیوں کا ابھی زور کم نہیں
تیور بتا رہے ہیں یہ گرد و غبار کے

ناخداؤں سے یہ طوفان سمیٹا نہ گیا
ورنہ طوفان سمٹتا تو کنارا ہوتا

وہ اپنے آپ سے نا آشنا ہے
جو دُنیا کی شکایت کر رہا ہے

نظر میں جو ہمیشہ دوسروں کے عیب رکھتا ہے
اگر بھولے سے بھی وہ آئنہ دیکھے تو ڈر جائے

جذبہ عشق کے حوالے سے دیوانگی اور پتھر کا تذکرہ اکثر ہوتا ہے قمر جمالی نے بھی یہ تذکرہ کیا لیکن ایک نئے انداز سے ۔

کوئی سمجھے تو محبت کی زباں ہے یہ بھی
آج تک کرتا ہے لوگوں کو اشارہ پتھر

زندگی در حقیقت عزم سفر سے عبارت ہے لیکن سہل پسند طبیعت اس حقیقت سے نا آشنا ہوتی ہے۔قمر جمالی نے یہی بات اس انداز میں کہی ہے ۔

فکرِ منزل ہے سفر سے پہلے
کبھی نکلے بھی ہو گھر سے پہلے

اور قمر جمالی کا یہ شعر تو فن شعر گوئی پر ان کی بھر پور گرفت کا بڑا واضح ثبوت مہیا کر دیتا ہے ۔

کوئی دیکھے تو ہمارے سوز گریہ کا فروغ
سینۂ دریا میں سوتی دامنِ ساحل میں آگ

قمر جمالی اچھے انسان ہیں، باہمت انسان ہیں، اپنا بوجھ دوسروں پر نہیں ڈالتے، دوسروں کا بوجھ اٹھا لیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔زندگی برتنے میں سلیقے کی جو روایات ہمارا، ہم برصغیر کے مسلمانوں کا، اثاثہ تھیں۔انہوں نے ان روایات کو قائم رکھا ہے اور آگے بڑھایا ہے اور یہ بات ان کے لئے بجا طور پر طمانیت کا باعث ہے۔

انہوں نے سچ کہا ہے اور خوب کہا ہے ۔

فخر سے سر بلند ہے میرا
یہ بھی اعجاز خاکساری ہے

اس فکری پس منظر کے ساتھ "صحرا میں شجر" کا مطالعہ کیجئے بہت سے اشعار ایسے ملیں گے جو خود آپ کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔یہ برجستگی قمر جمالی کے اشعار کی مقبولیت کی ضامن ہے۔

☆☆☆

یٰسین خان بہار شاہجہان پوری
استاد شعبۂ اردو لندن کالج آف مینجمنٹ ۔ کراچی

قمر جمالی کی شاعری......ایک سرسری جائزہ

وقت و حالات پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ دورِ حاضر میں علمی و ادبی تخلیقات کی رفتار سست پڑ گئی ہے معاشرے کی اجتماعی سوچ اور تخلیق کار کے زاویہ فکر میں جو قدرِ مشترک یا دونوں میں جو فکری یگانگت درکار ہے وہ اب کم ہوتی جارہی ہے۔ اسی فکری اور نظریاتی اختلاف کی وجہ سے کسی علمی و ادبی تخلیق کو وہ پذیرائی نہیں ملتی جو لکھنے والے کو تخلیقی عمل پر اُکساتی اور آمادہ کرتی ہے۔ سماج اور قلمکار کے درمیان اس فکری بُعد و تضاد کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والے کا شعلۂ احساس رفتہ رفتہ مدھم ہو کر بجھ جاتا ہے اور اس طرح تخلیقی سفر کرنے والا تاریکی و بے نوری کی فضائیں ٹٹول کر چلنے لگتا ہے۔ قدم سست پڑنے لگتے ہیں اور بسا اوقات وہ عزمِ سفر سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

ہمارے مادّی مطالبات، ہوسِ زر، معاشی ناآسودگی اور جذبۂ مسابقت نے علم و ادب سے ہمارے ذہنی رشتے کو بے حد کمزور کر دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مادّی خوش حالی۔ سامانِ عیش و نشاط کی فراہمی اور دوسروں پر اپنی ثروت و حشمت کا تاثر قائم کرنے کے لئے

جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس کے نتیجے میں قاری اور لکھنے والے کے درمیان جو مذاق کی اکائی قائم تھی باقی نہ رہ سکی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ فاصلہ بڑھ رہا ہے اور اختلاف کی خلیج وسیع ہو رہی ہے۔

علم وادب سے بے تعلقی اور عدم دلچسپی کا ایک اور بھی طبقہ ذمہ دار ہے اور وہ ہے ہمارا حکمراں طبقہ۔ جس نے مختلف کھیلوں، کریکٹ اور رقص وموسیقی کی گرم بازاری کے لئے تمام ممکنہ اسباب فراہم کر دیئے ہیں حکومتی اشارہ پر ذرائع ابلاغ اس ناخوشگوار فریضہ کی ادائیگی میں انتہائی مستعدی کے ساتھ مصروف نظر آتے ہیں۔ ان چیزوں کو ٹی۔ وی اور دوسرے ابلاغ کے ذریعہ اس درجہ دلچسپ و پرکشش بنایا جارہا ہے کہ ان مقابلوں کے ایام و اوقات میں دفتروں اور درسگاہوں میں حاضری برائے نام رہ جاتی ہے۔ بازاروں میں سناٹا ہو جاتا ہے۔ ارباب حکومت کھلاڑیوں کو بڑے بڑے انعامات سے نوازتے ہیں۔ کھلاڑیوں کے لئے بہترین ملازمتوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ مُکّا بازوں کو لاکھوں روپئے کی خطیر رقم سرکاری خزانے سے بطور انعام دی جاتی ہے۔ لیکن ایک علمی وادبی تخلیق کے معرض ظہور میں آنے پر ارباب اقتدار کو جنبش لب کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ علم و ادب کی حوصلہ افزائی کے لئے انعام تو کجا ان کے پاس نہ زبان ہے نہ قلم۔ پوری قوم اور بالخصوص نوجوان نسل کو لہو لعب کا گرویدہ بنا دیا گیا ہے۔ ارباب اختیار یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ کسی قوم کی سچی عزت وعظمت اسکی علمی وفکری کاوشوں اور کارناموں کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔

دراصل اکثر ارباب اقتدار نے اپنی غلط کاریوں، ذاتی مقاصد کے حصول اور کرسی اقتدار پر براجمان رہنے کے لئے عامۃ الناس اور نوجوان نسل کو کھیل کود اور رقص و سرود کی طرف مائل کر دیا۔ حکمراں ٹولہ نے شمشیر وسناں کے خوف سے قوم کے لئے طاؤس و رباب کی محفلیں سجانے کے اسباب عام کر دیئے۔ ملک کے سارے چھوٹے بڑے راستے کھیل کے میدان بن چکے ہیں۔ لوگوں کو کاروں کے شیشے مکانوں کی کھڑکیاں اور اپنی کھوپڑیاں بچانا محال ہو گیا ہے۔ اس صورتِ حال کو علمی وادبی دنیا کا بدترین سانحہ کہا جاسکتا ہے۔ ایسے نامساعد اور ہمت شکن حالات میں قرطاس وقلم سے وابستہ رہنے والے مجاہدین

علم وادب قابلِ صد مبارکباد ہیں۔

احیائے علم وادب کی راہوں میں سرگرم سفر حضرات کی فہرست میں ایک معتبر اور بڑا نام قمر جمالی صاحب کا بھی ہے جن کا پہلا شعری مجموعہ "صحرا میں شجر" ۱۹۹۸ء میں شائع ہو کر اہلِ ذوق سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ان کا دوسرا مجموعۂ کلام بھی ترتیب واشاعت کی منزلیں طے کر کے انشاء اللہ جلد ہی اربابِ ذوق کی تسکین قلب ونگاہ کا سامان فراہم کریگا۔

نقادانِ علم وادب نے کسی علمی وفکری کاوش کی کامیابی کو پرکھنے کے لئے جو میزان ومعیار وضع کئے ہیں ان کے مطابق ہر وہ علمی وادبی تصنیف جو مفید ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھنے والے کے دل ودماغ کو محظوظ ومسرور کرے کامیاب علمی وادبی کارنامہ قرار دی جا سکتی ہے۔ اس روشنی میں قمر جمالی کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ مذکورہ معیار ومیزان پر پورا اتر رہا ہے۔ اس لئے کہ اس میں درسِ حیات بھی ہے اور جمالیاتی حس کی آسودگی کا سامان بھی۔ یہ وہ کلام ہے جس کو پڑھ کر واقعی دل خوش ہوتا ہے اور آگے پڑھنے کو جی چاہتا ہے نہ نگاہیں تھکتی ہیں نہ دماغ بوجھ محسوس کرتا ہے۔ زیرِ ترتیب اس مجموعہ میں جاندار اور فکر انگیز اشعار کی کمی نہیں۔ اس کلام کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک بالیدہ اور رسا ذہن کی فکری توجہ کا نتیجہ ہے۔ ایک بات اور بھی عرض کرتا چلوں کہ کسی ادب پارے اور شعری مجموعے میں شاعر وادیب کے مزاج وذہن کی پرداخت اور نفسیاتی تشکیل کا پورا پورا دخل ہوتا ہے۔ ذہن ومزاج اور نفسیاتی تعمیر کوئی اتفاقی چیز نہیں ہوتی بلکہ اس میں خاندانی پس منظر اور تہذیبی ماحول کو کلیدی اور مرکزی مقام حاصل ہوتا ہے۔ قمر جمالی کی خلاقیِ سخن اور ان کے دلآویز کلام میں ان کی خاندانی پرورش وپرداخت اور ان کا گرد وپیش زیادہ معاون نظر آتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ کسی خاص تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کے بغیر اچھے شعر وادب کی تخلیق ہو ہی نہیں سکتی۔

قمر جمالی کے کلام میں وطن، ترکِ وطن یا ہجرت کی شدید جذباتیت کا اظہار بھی ملے گا ناسازگار حالات کا شکوہ بھی اور ماحول کی ستم ظریفیوں کا کرب بھی۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں ان کے لہجہ میں تلخی کہیں غمگینی اور کہیں نشاطِ غم کی پُر کیف وپُر سوز فضا کا احساس ہونے

لگتا ہے۔ ان کے اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

آمدِ گل کی فضا دیکھنے والا میں کون
یہ دھواں ہے کہ گھٹا دیکھنے والا میں کون
جبرِ دولت کے سبب گھٹ گئیں کتنی چیخیں
جانبِ محل سرا دیکھنے والا میں کون

ان اشعار میں جس اجمالِ طبع سے کام لیا گیا ہے وہ بڑی سے بڑی تفصیل سے بھی ممکن نہیں تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر شاعری میں دل گرفتگی نشتریت اور سوز و گداز نہ ہو۔ صرف حکمت فلسفہ تلقینِ اخلاق اور دینی مسائل کی تعلیم و تبلیغ ہو تو وہ شاعری کے دائرہ سے نکل کر خطابت کے مقام کی کوئی چیز بن جاتی ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ سوز و گداز اور دل گرفتگی ہی دراصل غزل کی رُوح ہے۔ اسی کا ہونا یا نہ ہونا کلام کو مرغوب و مردود بناتا ہے اور یہی اس کے ردّ و قبول کا سبب بنتا ہے۔ قمر جمالی نے اسی ادبی و شعری مسلک کے اصول و آئین کو سامنے رکھ کر اپنے تخلیقی و فکری عمل کو آگے بڑھایا ہے۔ آیئے اب ان کے ان اشعار کو پڑھیں اور لطف اُٹھائیں۔

آگ بھر دیتی ہے تنہائی میں ساون کی جھڑی
آتشِ عشق کو چھینٹے بھی ہوا دیتے ہیں

تیری قربت کا تصور تیری یادیں ترا غم
اتنے ساماں ہیں کہ ہم بے سر و ساماں بھی نہیں

سجا رہا ہوں تصور میں اس کی انگڑائی
دھنک کے رنگ زمیں پر اُتر گئے ہوں گے
سیاہ تھی مگر اتنی نہ تھی شبِ ہجراں
کسی عروس کے گیسو بکھر گئے ہوں گے

جانا تیری تمنا کون کرتا
اگر ملنا ترا آسان ہوتا

جس کا کوئی سبب نہیں ہوتا
ایسی آزردگی کو کیا کہیے

بس یہ کہہ کر چلا گیا کوئی
تم بہت مجھ کو یاد آو گے

آپ کو کس طرح بھلا دوں میں
دل سے دھڑکن جدا نہیں ہوتی

جب انتہا پہ پہنچتا ہے کرب تنہائی
تو گفتگو درو دیوار کرنے لگتے ہیں

یہ اشعار بھرپور رنگ تغزل کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ان کو سن کر کوئی صاحب ذوق اور صاحب دل ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان اشعار کے لہجے میں جو نشتریت ،فکر کی سچائی اور دل گرفتگی نظر آرہی ہے اور زبان و بیان کی جس شستگی اور شیرینی کا احساس ہو رہا ہے دراصل شاعری اور بالخصوص غزل اسی سے عبارت ہے۔ قمر جمالی کے کلام میں مشاہداتی عنصر بہت نمایاں ہے۔ وہ غم دل اور غم دنیا دونوں کے ستائے ہوئے انسان ہیں ان کا شعری سرمایہ ماحول کی کلیت کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے ان کے یہ اشعار دیکھیے۔

ہر طرف طاقوں میں رکھے جا رہے تھے آفتاب
جاگنے کی رات تھی اہل شبستاں سو گئے

اس بشر کی تلاش ہے مجھ کو
جس سے کوئی خطا نہیں ہوتی

سحر ہوتے ہی ننگے سر نظر آنے لگے سارے
بہت سے صاحبِ دستار تھے کل شب جہاں میں تھا
جنہوں نے میرے گھر کی رونقیں لوٹی تھیں جی بھر کے
وہ سب ساتھی پسِ دیوار تھے کل شب جہاں میں تھا
مسیحا کیا دکھاتا کوئی اعجازِ مسیحائی
سبھوں کے ذہن و دل بیمار تھے کل شب جہاں میں تھا

❖❖

تشنگی نے جس قدر بخشی ہمیں آسودگی
اس قدر سیراب دریا کے کنارے بھی نہیں

یہ شعر تو ہمارے معاشرے اور بالخصوص نوجوان نسل کی علمی و اخلاقی حالات کا نوحہ معلوم ہوتا ہے۔

ہو گئی گم متاعِ علم و ادب
اور کیا رہ گیا ہے کھونے کو

قمر جمالی کے فکر و فن اور قوتِ مشاہدہ کے ثبوت کے لئے یہ اشعار حوالہ بن سکتے ہیں۔

جو اُترتے ہیں دل میں باتوں سے
ایسے خنجر نظر نہیں آتے

❖❖

دیکھے ہیں ہم نے ایسے بھی کچھ تیرگی پسند
سورج کو جو اُفق سے اُبھرنے نہیں دیتے
ایسے بھی کچھ دیئے ہیں سرِ راہِ زندگی
منہ زور آندھیوں کو گزرنے نہیں دیتے

❖❖

سفر میں بے سرو ساماں ہی اچھا
میں تھک جاتا اگر سامان ہوتا

❖❖

لے کر چلے تھے دوش پہ کاغذ کی کشتیاں
صد شکر راستے میں سمندر نہیں ملا

قمر جمالی کے درج ذیل اشعار کو دیکھئے ان میں شاعرانہ حسن کے ساتھ تلقینِ اخلاق بھی ہے۔ شکوۂ ظلم و جبر بھی اور درسِ رموزِ حیات بھی۔ ان اشعار میں حسنِ بیان، زبان کی سلاست و صفائی اور قدرتِ اظہار دیکھنے کے لائق ہے بعض شعر تو قدرتِ فکر کے ساتھ ساتھ سہلِ ممتنع کی نادر مثال بن گئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

پہنچا ہوں کس مقام پہ ذوقِ طلب لئے
میں جس جگہ پہ خود کو بھی اکثر نہیں ملا

تشنگی نے جس قدر بخشی ہمیں آسودگی
اسقدر سیراب دریا کے کنارے بھی نہیں

اور کتنا لہو بہاؤ گے
کیا یہاں کربلا بناؤ گے
مت اُڑاؤ سمندروں کا مذاق
تم جزیرے ہو ڈوب جاؤ گے
پہلے سمجھو حقیقتِ ذرہ
گھر میں سورج اُتار لاؤ گے
زندگی سے نظر ملاؤ تو
سانس لینا بھی بھول جاؤ گے

اب ان اشعار کو دیکھئے یہاں قمر جمالی خود سے متعارف ہوتے نظر آتے ہیں۔

مصائب کے گہن سے جب بھی نکلے
قمر سارے جہاں پر چھا گئے ہم

تجربوں کی دھوپ بن جاتی ہے سایہ ایک دن
ہم سرابوں سے نکل آئے تو دریا ہو گئے

اب جبکہ غزل لفظی صنعت گری اور مبالغہ آرائی کے دائرہ سے باہر نکل آئی ہے اور پوری توانائی کے ساتھ مسائلِ حیات کی عکاس بنتی جارہی ہے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ شاعر کے کلام میں ماحول کی صداقتوں کا احساس وادراک کس حد تک موجود ہے۔ اس کی شاعری زندگی کے مسائل کو کہاں تک جذب کرنے کی قدرت وصلاحیت رکھتی ہے۔ قارئین کو یہ بات بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ماحول کی سچائیوں اور صداقتوں کے اظہار کے ساتھ ساتھ غزل میں ذوقِ جمال کی آسودگی کا سامان بہت ضروری ہے یہ بات سچ ہے کہ شاعر کتنا ہی متین و سنجیدہ اور کسی دینی مسلک سے پیوستہ کیوں نہ ہو اس کا رومانی ہونا بہت ضروری ہے ورنہ شاعری جمالیاتی اثر آفرینی سے محروم ہو جائے گی۔ قمر جمالی کا کلام پڑھ کر یقین آجاتا ہے کہ جہاں ان کی شاعری میں معاشرے کی مفید اور قابلِ ذکر باتوں کو شعر کے قالب میں بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ ڈھالا گیا ہے وہاں اسی کے ساتھ میں ہماری جمالیاتی حس کی تسکین کا سرمایہ بھی موجود ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غزل اگر رنگِ تغزل سے معرا ہو تو وہ قاری اور سامع کو متاثر و محظوظ کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے۔ ماحول کی صداقتیں اور جذباتِ محبت کی نزاکتیں مل کر ہی غزل کو اعتبار وامتیاز بخشتی ہیں۔

آخر میں ان کے یہ شعر دیکھئے ۔

صلہ مشقِ تصور کا دل آخر پا ہی جاتا ہے
دریچے بند ہوتے ہیں تو کوئی آ ہی جاتا ہے
خوشی کیوں ہے کہ دامن میں ستارے ٹوٹ آتے ہیں
ہجومِ یاس میں یہ خواب تو دیکھا ہی جاتا ہے

❖❖

شدید پیاس میں کیا ہو سراب کی پہچان
سمجھ کے جھیل پرندے اتر گئے ہو نگے

❖❖

صدا جرس کی نہ آئی غبار بھی نہ اُٹھا
بس اتنی دور مرے ہم سفر گئے ہوں گے

❖❖

زندگی بھر بس غمِ تعمیر تڑپاتا رہا
آشتی کے خواب کیا دیکھے سکوں جاتا رہا

میں نے ان کے بیشتر اشعار تاویل و تشریح اور وضاحت کے بغیر درج کر دیئے ہیں ان سے ان کی شاعری کے خدوخال پوری طرح اُجاگر ہو رہے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے، کہ ان اشعار سے ان کے ذوقِ شعری کی تحلیل و تفرید ہو رہی ہے ان کی فکری کاوشوں سے یہ بھی ثابت کرنا مقصود ہے کہ ان کی شاعری میں قاری کے قبولِ تاثر کے لئے کیا کچھ موجود نہیں۔

میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے لہجے، طرزِ اظہار، شیرنیِ بیان اور ایک منفرد اندازِ فکر نے ان کی شاعری کو اعتبار کا وہ مقام بخش دیا ہے جہاں وہ غزل کی تاریخ میں اپنے لئے امتیازی جگہ بنا چکے ہیں۔ میں ان کے اس جمیل فکری سرمایہ کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اربابِ ذوق ان کے کلام کو قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

☆☆

پروفیسر ڈاکٹر سلطان الطاف علی
کوئٹہ

زیست شناس شاعر...... قمر جمالی امروہوی

شاعر تہذیب وتمدن کا امین اور اپنی قوم کا دھڑکتا ہوا قلب اور پر سوز جگر کا حامل ہوتا ہے۔اس کے ساتھ ہی ایک اچھا شاعر اپنے معاشرے کے تمام نقوش کو منعکس کیا کرتا ہے۔شاعر کسی بھی صنف میں اپنے فن کا اظہار کرے وہ اس میں اپنے معاشرے کے احوال وامثال کو لا کر پیش کر دیتا ہے۔اور جو صاحب سخن اپنی ملت اور اپنے ملک کے احساسات و جذبات کو پیش نہ کرے اُس کا ہرگز ہرگز اپنی قوم وملت سے تعلق نہیں ہوتا جیسے ہمارے لئے ورلڈ بینک یا آئی ایم ایف کے ماہرین ہوں، اُس سے زیادہ اُن کی حیثیت نہیں ہوتی۔

جناب قمر جمالی کی شاعری کا میں نے پوری طرح مطالعہ کیا اور اُس میں وطنِ عزیز پاکستان کی تریپن سالہ تاریخ کے اوراق پورے درد وسوز سے لبریز نظر آئے۔اس میں مجھے قمر جمالی امروہوی کا میدانِ سخن غزل ہی نظر آیا۔شاعری میں غزل ہی وہ صنف ہے جو یقیناً عظیم فن وادراک کی حامل ہوتی ہے۔جناب قمر جمالی نے غزل کے اندر روایتی رومان کو پورا مقام عطا کیا ہے مگر رومان حسن وعشق کا وہ پیمان ہے جس میں ایک قوم کا احساسِ دوران کسی فکرِ تعمیر سے مملو ہے۔

آغاز میں جو حمد ہے اُس میں بھی خود شناسی کے لئے دعا کی گئی ہے، گویا

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ اس کا ما حصل ہے۔ نعت شریف میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیروی کا اظہار بڑے سادہ اور دوٹوک انداز میں ہے جو اطاعت وعقیدت کا عمدہ نمونہ ہے۔

بھٹک سکتا نہیں ہے وہ مسافر
جسے نسبت ہو اُن کے نقش پا سے

مجھے جناب قمر جمالی امروہوی کی شاعری کو پڑھ کر دلی مسرت اور استعجاب کے ملے جلے جذبات کا احساس ہوا۔ اُن کی پوری شاعری میں کوئی ایک ایسا شعر نہیں ملتا جو بے مقصد و بے معنی ہو۔ اُن کی شاعری حقائق ہی حقائق سے لبریز ہے۔ گویا محض شاعری نہیں۔ اگر اس میں سے انتخاب کرنا پڑا ہے تو وہ بھی اہم نکات کے لئے جو میری نظر میں اہم تھے۔ کئی شعر اور مصرعے تو روزمرہ کے محاوروں میں مقبولِ عام ہو سکتے ہیں۔

صوفیا و عارفین نے تخلیقِ کائنات پر بہت کچھ لکھا ہے اور قمر جمالی امروہوی صاحب بھی بڑے منفرد انداز میں بیان کرتے ہیں ۔

حسن موجود تھا تخلیقِ بشر سے پہلے
آئینہ کوئی نہ تھا آئینہ گر سے پہلے

قمر جمالی تندی و ترشی کے عالم میں بھی پُر امید رہتے ہیں۔ گویا اُن کے مسلک میں مایوسی کا وجود نہیں ۔

منزل کو اُبھرنا ہے اسی گردِ سفر سے
اُڑتی رہے کچھ دیر یونہی گردِ سفر سے

اسی موقف پر مضبوط ہیں اور ایک مقام پر کہتے ہیں ۔

میں یہی سوچ کے بجھنے نہیں دیتا اس کو
دل جو روشن ہے تو ہر سمت اُجالا ہو گا

اور ۔

رہا گلشن تو پھر اک دن بہاریں لوٹ آئیں گی
کرو تدبیر یارو اب تو گلشن کو بچانے کی

قمر جمالی عالمی اور علاقائی سطح کے مضطرب حالات پر بھی پریشان ہیں ۔

شوقِ آزادی چمن میں لے تو آیا ہے ہمیں
ہم یہاں اپنا نشیمن بھی بنا پائیں گے کیا

❖❖

اس سے بہتر تھا اندھیرے میں بسر کر لیتے
رات کے بعد جو انجامِ سحر دیکھا ہے

اور ۔

کم نہ ہو پائی اُداسی رات بھر
یوں تو اُس کی یاد بھی آئی بہت

وہ اہلِ معرفت کی طرح صاحبِ جنوں کو خرد مندوں سے بالاتر گردانتے ہیں ۔

چل رہے ہیں کس لئے اہلِ خرد کے ساتھ ساتھ
تیرے دیوانے بھی بستی میں اُتر جائیں گے کیا؟

وہ محبت کے رموز سے آشنا ہیں اسی لئے جرأتِ رندانہ کے متمنی ہیں ۔

ساقی کی نگاہیں تو ہیں مائل بہ محبت
رندوں میں مگر جرأتِ رندانہ نہیں ہے

اپنی بے لوث محبت کے داعی ہیں ۔

تیری چاہت کا تو دعویٰ ہے سبھی کو لیکن
کون ہم جیسا تجھے چاہنے والا ہو گا

اور ۔

ہم سا دیوانہ نہ ہو گا کوئی
یوں تو ہوں گے تیرے شیدائی بہت

وہ اس دنیا میں حقیقی دوست کو عنقا پاتے ہیں ۔

جو کسی کا بھی نہ ہو پایا کبھی
ہم بھی ہیں اس کے تمنائی بہت

مسرت و انبساط کے لمحات کم میسر آتے ہیں اور اب تو اعتبار بھی نہیں رہتا کہ آیا

کوئی واقعی خوشی کا وقت بھی آچکا ہے۔ رفعت سلطان اسی موضوع پر کہتے ہیں۔

خوشی تو خیر مقدر کی بات ہے رفعت
میری حیات تو محو یاس بھی نہ رہی

اور قمر جمالی اسی فکروخیال میں کہتے ہیں۔

شادمانی کے تصور سے بھی گھبرانے لگا
ایسی حالت تو نہ تھی میرے دلِ ناشاد کی

وہ زمانے کی ابتر روش پر خاموش رہنے کی بجائے شیزہ کاری کو ہر اچھے رہنما کی طرح پسند کرتے ہیں۔

جرم ہے اس شہر میں اب پیار کا اظہار بھی
نفرتوں سے کوئی تو ہو برسرِ پیکار بھی

اُن کے ہاں زندگی کے عمیق تجربات ہیں اور انسانی کیفیات پر انہیں عرفان حاصل ہے وہ جب کہتے ہیں۔

ہو جس بندے کا مسلک فقر و فاقہ
سمجھ لو بادشاہت کر رہا ہے

اور۔

یہ زندگی تو جہدِ مسلسل کا نام ہے
ہر لمحہ قیمتی ہے کوئی رائیگاں نہیں

وہ اسی بنا پر احتجاج وفریاد کرنے کے قائل نہیں۔ جہدِ مسلسل ہی مسائل کا حل ہے۔

آہ و بکا نہ کیجیے آہ و بکا سے فائدہ
آہ و بکا سنے کوئی اور بلا کے شور میں

اسی لئے اطمینان سے کہتے ہیں۔

اُس کو میرا سلام کہہ دینا
جب کوئی اس جہان سے گزرے

اور۔

حسینانِ جہاں پہلو میں دل رکھتے ہیں پتھر کے
میری تقدیر لکھ دے کاتبِ تقدیر پتھر پر

قمر جمالی صاحب کا ہنر زیبائی پر رسائی کا اضطراب ہی ہے۔ فرماتے ہیں۔

رات دن حسن کی تخلیق کیا کرتا ہوں
آپ نے کب میرا اندازِ ہنر دیکھا ہے

مزید برآں ہمارے شاعر کی راہ وروش دوسروں کی رہنمائی اور اُن کے لئے روشنی پیدا کرنا ہی ہے۔

وہ اپنے آپ سے نا آشنا ہے
جو دنیا کی شکایت کر رہا ہے

◆◆◆

آج تک جس کو کبھی دیکھا نہیں
وہ ہمارا مالک و مختار ہے

◆◆◆

عہدِ ماضی کے رفیقوں کو تو کیا پہچانتے
آئینے میں اپنی صورت تک نہ پہچانی گئی

◆◆◆

ایک لمحے کو تو ماضی کی طرف بھی پلٹوں
میری تصویر مجھے کوئی پرانی دے دے

اور قابلِ غور۔

قمر جس کے ستم کو آپ نے دل میں جگہ دی ہے
وہی آمادۂ لطف و کرم ہو گا تو کیا ہو گا

اور۔

کس سے پوچھوں کون بتلائے مجھے
جانے میں کس کام پر معمور ہوں

انسانی زندگی میں کوئی ایسا مجازی یا حقیقی تعلق ضرور ہوتا ہے جس کے ہوتے ہوئے وہ طمانیت وجرأت سے معمور رہتا ہے اور وہ ساتھ اگر کھو جائے تو زندگی محض یاسیت بن کر رہ جاتی ہے۔قمر بھی یہی کہتے ہیں۔

کیا بگاڑے گی گردشِ ایام
جب تیرا التفات باقی ہے

اور ۔

جب بھی اُس کی یاد آئی ہے
روشنی اور بڑھ گئی دل میں

ایک زیست شناس شاعر نے کہا ہے ۔

تبسم کی سزا کتنی بڑی ہے
کلی کو کھل کے مرجھانا پڑا ہے

قمر جمالی بھی تبسم گل کے مال کو بخوبی جان گئے ہیں اور کہتے ہیں ۔

ہنس دیئے کھل کے گل اور اُداس ہو گئے
جب بھی کوئی کلی کھلی بادِ صبا کے شور میں

اہلِ دل صاحبِ تاثیر ہوتے ہیں ۔

جن فقیروں کو سدا خاک بسر دیکھا ہے
اُن فقیروں کی دعاؤں میں اثر دیکھا ہے

❖❖

میں بے گھر ہوں تو اس کا غم نہیں ہے
دلوں میں گھر تو کرتا جا رہا ہوں

جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے قمر جمالی کا اصل صنفِ سخن غزل ہے اور پھر غزل میں رنگِ تغزل بھی بھرپور ہے۔ اس رنگِ تغزل کے ساتھ ترنم بھی عروج پر ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

جن کی خوشبو سے مہک جائے میری تنہائی
میرے آنگن کو کوئی رات سہانی دے دے

شہر ویران کر دیا میرا
عجب اندازِ شہر یاری ہے

اور ـ

خدا جانے ہجومِ شوق کا انجام کیا ہوگا؟
مجھے بدلی ہوئی سی وہ نظر معلوم ہوتی ہے

بعض غزلوں میں میر کی سی سادگی اور اختصار ملاحظہ ہو ـ

ترے جانے سے جو گزری ہے دل پر
وہ دل کا حال کیا کہتا کسی سے

اسی کا نام ہے شاید محبت
یہ دل روشن ہے جس کی روشنی سے

جس کو بخشی گئی ہے درویشی
وہ بھی تقدیر کا سکندر ہے

خدا یاد آتا ہے اُس وقت ہم کو
تمہیں جو خدا کی قسم دیکھتے ہیں

اپنے بھی بیگانے ہیں
شاید ہم دیوانے ہیں

ذکر وفا کا مت چھیڑو
سب جانے پہچانے ہیں

اور ـ

دیوانوں سے پرسش کیا
جانتے ہو دیوانے ہیں

تصوف و عرفان کی چاشنی قمر جمالی کے ہاں بخوبی موجود ہے۔

جب بھی لحد میں سوؤں میں بس میری آرزو یہ ہے
آنکھ کھلے تو اے خدا صلِ علیٰ کے شور میں

◆◆

جبینِ شوق میں سجدے تڑپ رہے ہیں مگر
نہ پا سکے تیرے نقشِ قدم تو کیا ہو گا

◆◆

میرا مسلک تو درویشی رہا ہے
میں کب دنیا کی دولت چاہتا ہوں

◆◆

تیرے دیدار کی حسرت ہے مجھ کو
فقط تیری زیارت چاہتا ہوں

◆◆

ربط باہم کیسے ہو سکتا ہے حسن و عشق میں
ان کی خو بدلی نہ اپنی چاک دامانی گئی

◆◆

میرا اپنا جہان میں کچھ بھی نہیں
زندگی ہے سو وہ تمہاری ہے

◆◆

اک در کے سوا ہم نے قمر غیر کے آگے
سیکھا ہی نہیں آج تلک سر کو جھکانا

◆◆

ہمیں تو جب بھی مصائب نے آ کے گھیرا ہے
نگاہ رک گئی جا کر سنہری جالی پہ

آخر میں قمر جمالی کی محب الوطنی کا انداز بھی ملاحظہ ہو!

قمر ہم اس کے لئے جان دیدیں گے
جو آنچ آئی کبھی پرچم ہلالی پہ

بہر حال اپنے شعری مجموعے میں قمر جمالی امرہوی صاحب نے جدید شاعری کے تنوع، مشکل خیال پسندی، علامتی اور اشاراتی الفاظ سے ہٹ کر واضح فکر اور سہل انداز کو اختیار کیا ہے۔ جو اچھے ادب و ابلاغ میں مطلوب ہوتا ہے اور آج بھی ضرورت ہے۔

☆☆☆

maablib.org

راغب مرادآبادی کے ساتھ قمر جمالی

امر حسینی قمر جمالی کو گلدستہ پیش کر رہے ہیں

پروفیسر سحر انصاری، قمر جمالی اور افتخار عارف

مرکزی وزیر ہاؤسنگ جناب صفوان اللہ، سٹی ناظم مصطفیٰ کمال کے ساتھ قمر جمالی ودیگر

شیخ الجامعہ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، قمر جمالی اور افضال صدیقی

قمر منصور قمر جمالی کو ایوارڈ دیتے ہوئے

قمر جمالی، جگن ناتھ آزاد کو اپنا شعری مجموعہ پیش کر رہے ہیں

دبستان مصحفی میں جگن ناتھ آزاد کے ساتھ افضل منگلوری، سراج الدین، نقوش نقوی
جگن ناتھ آزاد، قمر جمالی، عاصم صدیقی اور امر حسینی

روشن علی عشرت کلکتوی

قمر جمالی کی شاعری میری نظر میں

دوسرے لوگوں کی طرح قمر بھی اس معاشرے میں ایک دکھی انسان ہے لیکن وہ خود خوش رہ کر دوسروں کو خوش دیکھنا چاہتا ہے انکساری اس کا شعار ہے، بجز اس کا مسلک، خوش اخلاقی اور ملنساری اس کو ورثے میں ملی ہے۔ انسانیت کی علمبردار ہستیوں کا پیروکار ہونے کی حیثیت سے وہ رعونت سے اپنا دامن بچاتا رہتا ہے کینہ پرور محفلوں سے گریز اس کی اعلیٰ ظرفی کا نمایاں حصہ ہے وہ جرأت مند بھی ہے دردمند بھی دوسروں کے دکھوں کا مداوا کرتا ہے اس طرح خود کو بھی خبر نہ ہو۔

وہ کامرانی کے سورج کی تلاش میں وقت کے مہیب اور دبیز اندھیروں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ وہ جس قدر دردشناس ہے اُسی قدر زمانہ شناس بھی۔ شاعری کے علاوہ اُسے سیاست پر بھی کافی دسترس حاصل ہے۔ وہ وقت کی مصلحت پسندی پر بھرپور تنقید کرتا ہے ہمہ وقت مشکل ترین راہوں سے گزرنے کے لئے سینہ سپر رہتا ہے اس کی یہی لگن محنت کش عوام کا ترجمان بننے میں ممد و معاون ثابت ہوئی ہے۔ حقیقتاً اُس کی یہی کاوش اُس کے فن کی معراج بھی ہے۔

قمر کو اس کی شاعری کے آئینے میں دیکھئے تو وہ قد آور نظر آئے گا۔ وہ اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق اپنی فکری کاوش کو فن کے خوبصورت ملبوسات سے آراستہ کر کے

ڈاکٹر رضیہ حامد
مدیر سہ ماہی فکر و آگہی ۔ دہلی

قادر الکلام اور پُر گو شاعر......قمر جمالی

قمر جمالی امروہوی تقریباً ۵۰ سال سے شاعری کی وادیوں ، چمن زاروں ، صحراؤں میں سرگرمِ سفر ہیں "صحرا میں شجر" ان کی شاعری کا مجموعہ ضرور ہے مگر یہ انتخاب پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں شامل اکثر غزلوں میں ۱۲، ۱۳ اشعار ہیں جو اُن کی قادر الکلامی اور پُر گوئی کی دلیل ہیں۔

قمر جمالی حیات و کائنات کے اسرار و رموز سے واقف ہیں۔ تصوف پند و نصائح کو بڑی خوبی سے اشعار میں ڈھالا ہے دیانتداری اور حسنِ اخلاق کے ساتھ وارداتِ قلب اور معاملاتِ حسن و عشق جیسے موضوعات ان کی غزل میں موجود ہیں۔ قمر جمالی غزل کی روایت اور تہذیب کے علمبردار ہیں۔ ان کے کلام میں سماجی زندگی کی ہنگامہ آرائی، معاشرتی زندگی کا انحطاط جیسے موضوعات نے درد و تڑپ پیدا کردی ہے۔ قمر جمالی نے اپنے احساس و فکر کو سچائی کے ساتھ شعر کے قالب میں پیش کیا ہے۔

قمر جمالی کی زبان سادہ و سلیس ہے۔ الفاظ کا استعمال بہت خوبصورت ہے۔ جس سے نغمگی پیدا ہوئی ہے۔ بیان میں برجستگی اور بے ساختگی ہے کہیں کہیں شعر میں مکالماتی انداز اختیار کیا ہے قمر جمالی کی غزلوں کے اکثر اشعار ضرب المثل کے زمرے میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی "صحرا میں شجر" میں قمر جمالی کا نظریۂ شعری نظریۂ حیات

جا بجا موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

اے قمر زندگی کا ہر لمحہ
زندگی کی اساس ہوتا ہے

❖❖

تشنگی روح بجھ جائے تو مر جاتا ہے عشق
زندہ رہنے کے لئے پیاسا رہا کرتا ہوں میں

❖❖

مجھے کچھ بھی دے نہ دے ایک میرے مالک
شعور علم و حکمت چاہتا ہوں

❖❖

مرے اجداد سے ورثے میں ملا ہے جو مجھے
بس وہی رنگ ابھی تک مری پوشاک میں ہے

❖❖

کہا میں نے محبت چاہتا ہوں
کہا اُس نے ترا حسنِ طلب ہے

❖❖

ممکن ہے نکل آئے ادھر کوئی مسافر
صحرا میں لگاتے چلو دو چار شجر اور

❖❖

کوئی دیکھے تو ہمارے سوز گریہ کا فروغ
سینۂ دریا میں موتی، دامنِ ساحل میں آگ

❖❖

یوں گھر سے اُداسی کو نکلنے نہیں دیتا
نکلے تو کہیں دیکھ نہ لے یہ کوئی گھر اور

ہم نہ ہوتے تو اے غمِ دوراں
کون کرتا تری پذیرائی

ہمن پر کیا ہمارا حق نہیں ہے اے چمن والو
جلائے جائیں گے آخر ہمارے آشیاں کب تک

روشنی کچھ تو ملے کچھ تو اندھیرا کم ہو
اک دیا ہم نے سرِ راہ جلا رکھا ہے

وہ مجھے ذات کا عرفان عطا کر یارب
جو مری منزلِ دشوار کو آساں کر دے

maablib.org

سید قمر رضی

''صحرا میں شجر'' اور قمؔر جمالی امروہوی

قراۃ العین حیدر نے اپنے سوانحی ناول '' کارِ جہاں دراز ہے'' کی جلد اوّل میں ایک جگہ لکھا ہے۔

''امروہہ جو پہلے علم و دانش کی وجہ سے مشہور تھا اب اسے لوگ چند نامور فلمی شخصیتوں کی وجہ سے جانتے ہیں۔ اسی طرح کہ بھوپال کی نواب سلطان جہاں بیگم خلد آشیانی کا نام اب کسی کو یاد نہیں البتہ شرمیلا ٹیگور بہ حیثیت عائشہ سلطان موجودہ بیگم بھوپال کی بہو ہیں......''

محترمہ قراۃ العین حیدر کا شمار برصغیر کے نامور دانشوروں میں ہوتا ہے اور وہ ایک مانی ہوئی ادیبہ ہیں، ان کے جذبات کی ہم قدر کرتے ہیں مگر ان کے خیال سے اتفاق ممکن نہیں ہوسکتا کہ برصغیر کا ایک عام آدمی کمال امروہی، نجم نقوی، منظور امروہوی (آرٹ ڈائریکٹر) کفیل آذؔر (نغمہ نگار) اور فلم اسٹیج، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مشہور اداکار منور سعید کی وجہ سے امروہے کا نام جانتا ہو، مگر حقیقتاً امروہے کی پہچان کل بھی اور آج بھی علم و دانش، شعر و ادب اور فنون کی وجہ سے ہی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ادب کا کوئی طالب علم شمالی ہند کے

پہلے مثنوی نگار اسماعیل امروہوی، میر تقی میرؔ کے معنوی استاد سعادتؔ امروہوی، استاد الاساتذہ شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ، فرزدق ہند شمیمؔ امروہوی، مولانا نسیمؔ امروہوی اور رئیسؔ امروہوی کو فراموش کر چکا ہو یا یہ کہ خود محترمہ قرۃ العین حیدر جونؔ ایلیا، ساقیؔ امروہوی، زبیر رضوی، رضاؔ امروہوی، ڈاکٹر ہلالؔ نقوی، ڈاکٹر عظیم امروہوی، خمار فاروقی، کوثر نقوی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، شہبازؔ صدیقی، صادقین، افسر مدیا اقبال مہدی سے ناواقف ہوں۔ یہی لوگ اور ان جیسے ان گنت شاعر ادیب اور فنکار امروہے کی پہچان اور اس کی آبرو ہیں۔

یوں دیکھا جائے تو امروہہ کے علماء ادباء شعراء اور فن کار شہرت کے کبھی طلب گار نہیں رہے اور گمنامی کی زندگی بسر کر کے گوشۂ عزلت میں اس جہانِ فانی سے گزر گئے اور ان کی نادر تخلیقات زمانے کی دست برد سے نہ بچ سکیں۔ افسر صدیقی امروہوی نے جو نہ صرف ایک نادرہ کار شاعر تھے بلکہ پاکستان میں ایک بڑے محقق تسلیم کئے جاتے تھے، ایک ''تذکرہ شعرائے امروہہ'' لکھا تھا جو پاکستان کے ایک بزرگ ادیب اور محقق کے پاس محفوظ ہے، شاید وہ بھی تاریخ شعروادب کا حصہ بن سکے۔ اس پس منظر میں جب بھی امروہہ کے کسی شاعر کا مجموعۂ کلام شائع ہوتا ہے یا کسی تنقید نگار اور ادیب کی کتاب شائع ہوتی ہے تو مجھے یک گونہ سکون ہوتا ہے کہ ایک شاعر و ادیب تاریخ ادب کا حصہ تو بنا۔ عزیزم احمد حسین صدیقی نے اپنی زیر تصنیف کتاب ''امروہہ...... کشور اولیاء'' میں میرے علم کے مطابق تقریباً ڈیڑھ سو شاعروں کا نمونۂ کلام پیش کیا ہے مگر ہنوز اس سمت میں ایک بھرپور کوشش کی ضرورت ہے۔ یقیناً افسر صدیقی مرحوم کا ''تذکرہ شعرائے امروہہ'' تو غیر معمولی نوعیت کا حامل ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کا امانت دار، حق امانت داری ادا کر دے اور مجھے یقین ہے کہ محترم موصوف ایسا ضرور کریں گے کیونکہ ان کو مرحوم افسر صدیقی سے جتنی محبت وعقیدت تھی اور ہے وہ شاید ہی کسی امروہوی کو ان سے رہی ہو۔

مجھے تو خوشی اس بات کی ہے کہ میرے محترم بزرگ قمر جمالی کا مجموعۂ کلام ''صحرا میں شجر'' شائع ہو گیا۔ اگر ان کی شاعری بھی طاقِ نسیاں کی زینت بنی رہتی تو ہم سوائے کفِ افسوس ملنے کے اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ شکر ہے کہ ان کا کلام منصہ شہود پر آیا اور شعروادب کی

تاریخ کا حصہ بن گیا۔ میں ان کو اس مجموعے کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

دل چاہتا تھا کہ اس مجموعۂ کلام پر تفصیلی مضمون لکھتا مگر شاید اس کے لئے مکلف نہیں ہوں۔ یہ چند سطریں تو بطور خاص لکھ رہا ہوں۔ ان کے کلام پر تبصرہ تو صاحبانِ نقد ونظر ہی کر سکتے ہیں مجھ جیسا کم مایہ شخص قلم اٹھانے کی جسارت کیسے کرے مگر میرے محترم کی خواہش اور بھائی ساقی امروہوی کا حکم ہے کہ کچھ لکھوں چنانچہ کچھ باتیں کہنا ہیں چاہے وہ کتنی ہی بے وقعت کیوں نہ ہوں۔

قمر جمالی کی شاعری سچے، کھرے جذبوں کی شاعری ہے۔ انہوں نے مٹتی ہوئی قدروں پر ماتم بھی کیا ہے اور اجتماعی مستقبل کے درخشاں خواب بھی دیکھے ہیں۔ انہوں نے ایک حساس شخص کی طرح گردوپیش کا مطالعہ کیا ہے اور کہیں بھی منافقت سے کام نہیں لیا۔ جو محسوس کیا اور مشاہدے میں آیا اسے شعر کے قالب میں ڈھال دیا۔ ان کے جذبات میں تیزی بھی ہے اور تندی بھی مگر انہوں نے فکری توازن بہر طور ہر جگہ باقی رکھا ہے۔ کہیں کہیں یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ قنوطیت کا شکار ہیں مگر وہ اپنی رجائیت سے اس قنوطیت پر غالب آجاتے ہیں۔ ان کے یہاں نہ صرف انسان دوستی ہے بلکہ دکھی انسانیت سے جذبۂ ہمدردی بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ غم جاناں اور غم روزگار دونوں ہی ان کے اندر کے شاعر کو ختم نہیں کر سکے۔ ان کی فکر رسا میں طاقت بھی ہے اور ان کا کائناتی شعور نئی دنیا کو جویا بھی۔ ان کے یہاں اگر کربِ ذات ہے تو وہ بیرونِ ذات کے مسئلوں کو بھی ذات کے مسئلوں سے کم تر نہیں سمجھتے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ قمر جمالی کے یہاں نہ تو خیالات کے اظہار میں ژولیدگی ہے نہ تصنع بلکہ بڑی شائستگی اور سادہ انداز سے ہلکے پھلکے شعروں میں بڑی بڑی باتیں حسین اور دلکش پیرائے میں کہہ دی گئیں ہیں سہل ممتنع میں شعر گوئی آسان کام نہیں ہے مگر انہوں نے جتنے خوبصورت، سبک اور روزمرہ کے الفاظ اپنی غزلوں میں استعمال کئے ہیں وہ اس کا پتہ دیتے ہیں کہ ان کی گرفت الفاظ اوران کے استعمال پر مضبوط ہے۔ یہی ان کا تشخص ہے اور یہی ان کی انفرادیت بھی۔

میں نے تو ان کی جتنی غزلیں پڑھیں، یہی پایا کہ ان کے شعروں میں ایک درد

ہے ،ایک کسک ہے اور احساس کی پاکیزگی ہے جس نے ان کے اشعار میں دل آویزی پیدا کردی ہے وہ ایک معمولی سی بات کو اکثر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سننے والا تڑپ اٹھتا ہے۔ان کی شاعری میں انسانیت کو جس طرح اجاگر کیا گیا ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ میں اس وقت تفصیل میں جانے کی صورتِ حال میں نہیں ہوں چونکہ یہ مختصر مضمون اس کا متحمل نہیں ہوسکتا تاہم اس موقع پر چند ایسے اشعار ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ان اشعار میں معنویت اور جذبات کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے وہ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

میں گفتگو کروں تو کروں کس زبان میں
اس شہر میں تو کوئی مرا ہم زباں نہیں

❖❖

سوچتا ہوں کہ سرِ دار نہ لے جائے مجھے
ایک جرأت جو مری فطرتِ بیباک میں ہے

❖❖

شہر ویران کردیا میرا
عجب اندازِ شہر یاری ہے

❖❖

ایک ہی شمع وفا کا یہ کرشمہ دیکھیے
ان کی محفل میں اجالا ، اور مری محفل میں آگ

❖❖

کوئی دشمن نہیں اگر ، تو چلو
دوستوں کو تلاش کرتے ہیں

❖❖

تم روز مجھے دیتے ہو الزامِ بغاوت
یہ بھی کبھی سوچا مرے منہ میں بھی زباں ہے

اے قمر ہر آدمی اس راز کو سمجھا نہیں
آدمیت چاہتی ہے جذبۂ ایثار بھی

☆☆

ساقی امروہوی

دوستی کا سفر

قمر جمالی میرے لڑکپن کے اُن دوستوں میں سے ہیں جن سے میری دوستی کا آغاز مکتب سے ہوا اس وقت قمر جمالی کا اسکول میں نام مثال احمد خاں تھا مکتب میں ہم ان کو اُن کے گھریلو نام بنے میاں کہہ کر پکارتے تھے۔ شاعری کا سفر بھی تقریباً ساتھ ساتھ ہوا اور یہ انکشاف اس وقت ہوا کہ ہم کچھ عرصے بعد ایک دوسرے سے جدا ہو گئے چونکہ ہماری درس گاہیں جدا ہو گئیں تھیں اور قمر امروہہ سے اپنے والدین کے ساتھ ریاست کھتیزی چلے گئے تھے جب وہ واپس آئے تو معلوم ہوا کہ وہ بھی شعر کہنے لگے ہیں اور میری شعر گوئی کا آغاز تھا ایک ابتدائی محبت اور خلوص اور شاعری کے حوالے سے قربت بڑھتی چلی گئی۔

یہ بنے میاں سے قمر جمالی ہو گئے اور میں بالے میاں سے ساقی امروہوی ہو چکا تھا ہمارا سفر جاری تھا کہ ہمیں ہجرت کر کے بھارت سے پاکستان آنا پڑا اور پھر ہم ایک دوسرے سے کئی سالوں کے لئے جدا ہو گئے اور غمِ روزگار سے ہمیں اتنی فرصت نہ ملی کہ ایک دوسرے سے قریب ہوتے۔ قمر جمالی انتہائی ذمہ دار اور میں انتہائی لا اُبالی تھا اس لئے وہ بڑی جدوجہد کے بعد اپنے کاروبار میں مصروف ہو گئے اور میں زمانے کی ٹھوکریں کھاتا رہا قمر سے جب بھی ملاقات ہوتی تو وہ ہمیشہ نہ ملنے کا شکوہ کرتے اور میری لا اُبالی پر برہم بھی ہوتے تھے۔

بہر حال دوستی کا یہ سفر جاری رہا اور بحمد اللہ آج تک جاری ۱۹۷۸ء میں قمر کو ایک بہت بڑے صدمے سے دو چار ہونا پڑا کہ ان کی اہلیہ برضائے الٰہی داغ مفارقت دے گئیں جبکہ والدین کی شفقت سے پہلے ہی محروم ہو چکے تھے۔ اب کثیر والعیال ہونے کی وجہ سے ان کی ذمہ داریاں زیادہ بڑھ گئیں اور انہیں باپ کے ساتھ ماں کا کردار بھی بھرپور ادا کرنا پڑا۔ جس کا عکس ان کی شاعری میں نظر آتا ہے مثلاً وہ فرماتے ہیں ۔

اے قمر مجھ کو مرے چاند سے بچے سارے
میرے ہر خواب کی تعبیر نظر آتے ہیں

تیل جب تک دیئے کے اندر ہے
لو بڑھاتے رہو تو بہتر ہے

قمر کی شاعری میں تغزل کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی شعور بھی بھرپور نظر آتا ہے۔ قمر جمالی عملی طور پر بھی سیاست اور سماجی کاموں میں حصہ لیتے رہے ہیں کسی بھی تنظیم میں قمر کی شمولیت اس کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی ہے اور ان تنظیموں میں بھی وہ نمایاں رہے ہیں۔ میں قمر جمالی کے وہ شعر نذر قارئین کر رہا ہوں جو مجھے بہت اچھے لگے جس سے ان کی شخصیت سامنے آجاتی ہے ۔

دوستوں کی اس قدر بھرمار ہے
دشمنوں کو ڈھونڈنا دشوار ہے

دل پہ جو حرف بھی تحریر نظر آتے ہیں
اشک بن کر تری تصویر نظر آتے ہیں
ہم نے اللہ کے بندوں سے محبت کی ہے
اس لئے لائق تعزیر نظر آتے ہیں

اس سے بہتر تھا اندھیروں بسر کر لیتے
کے سحر دیکھا

یوں گھر سے اداسی کو نکلنے نہیں دیتا
نکلے تو کہیں دیکھ نہ لے یہ کوئی گھر اور

﴿﴾﴿﴾

بے ساختہ مرنے کو جی چاہنے لگتا ہے
جب بھی مجھے دیتا ہے جینے کی دُعا کوئی

قمر کے سیاسی اور سماجی شعور کا اندازہ اُن کے اِن اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

کس لئے فکرِ سحر کرتے ہو
رات آئے گی سحر سے پہلے

﴿﴾﴿﴾

چمن پر کیا ہمارا حق نہیں ہے اے چمن والو
جلائے جائیں گے آخر ہمارے آشیاں کب تک

﴿﴾﴿﴾

خود کو سورج کی تمازت سے بچانے کے لئے
سائے سے لپٹی ہوئی ہے آج کل دیوار بھی

﴿﴾﴿﴾

دو شعر نذرِ قارئین کر رہا ہوں جن میں بھرپور تغزل ہے۔

اِک گل بدن پہ اپنی جوانی کو وار کے
بیٹھے ہیں ہم بہار کا موسم گزار کے

ہم نے جو ایک لمحہ گزارا ہے پیار کا
حاصل نہ کر سکے اُسے صدیاں گزار کے

قمر کے یہاں زندگی کی تلخیاں بھی ہیں اور زندہ رہنے کا سلیقہ بھی میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اِس تازگی کو قائم رکھے اور جب تک جئیں انسانیت سے پیار کرتے رہیں۔

﴿☆☆﴾

پروفیسر اسحٰق اطہر

ایک تاثر

قمر جمالی صاحب سے پہلی ملاقات کے بعد ایک خوشگوار تاثر ذہن نے قبول کیا بعد کی ملاقاتوں میں یہ تاثر گہرا ہوتا چلا گیا وہ ایک ملنسار، وضعدار، متواضع اور شریف النفس انسان معلوم ہوئے ان کی گفتگو میں ایک عاجزانہ انداز ہے مگر کم تری کا احساس نہیں یہ عاجزی اور خاکساری ان کے خاندانی تہذیبی پس منظر کو ظاہر کرتی ہے۔ جہاں تک اُن کی شاعری کا تعلق ہے اس میں یہ وضعداری انکساری اور تہذیب نفس نظر آتی ہے میں نے ان کے مجموعے کو اس نقطۂ نظر سے اُٹھایا تھا کہ وہ ایک پُرانی وضع کے سکہ بند اور روایت پرست شاعر ہیں لیکن ایسا نہیں ہے ان کے ہاں روایت رچاؤ تو ہے مگر روایت پرستی نہیں وہ جدید کہلانے کے شوق میں موجودہ دور کے رسالوں سے اُٹھائی ہوئی تراکیب ولفظیات سے اپنی شاعری کو نہیں سجاتے بلکہ ان کے یہاں اس زبان وبیان کا رچاؤ ملتا ہے جو ان کے خاندانی پس منظر اور یہاں کے ماحول نے عطا کیا ہے وہ انجم فوقی بدایونی کے شاگرد ہیں لیکن ان کا اثر دو ایک غزلوں سے معلوم نہیں ہوتا وہ اپنی سرشت میں خالص امروہوی ہیں اور زبان و بیان وہی نظر آتے ہیں وہ غزل کی کلاسیکی روایات کی پاسداری کے ساتھ جدید زندگی کے مسائل وتجربات سے آگاہی بھی ان کی غزلوں میں نظر آتی ہے۔

وہ شے نا پید ہے دنیا میں شاید
زمانہ جس کی حسرت کر رہا ہے

❖❖

چمن پر کیا ہمارا حق نہیں ہے اے چمن والو
جلائے جائیں گے آخر ہمارے آشیاں کب تک

❖❖

ہم نے اس کو بھی بجھا کر رکھ دیا
جس دیئے سے روشنی پائی بہت

❖❖

وہ مرے فن میں جداگانہ مہک رکھتی ہے
خاکِ امروہہ کی خوشبو جو مری خاک میں ہے

❖❖

میرے اجداد سے ورثے میں ملا ہے جو مجھے
بس وہی رنگ ابھی تک مری پوشاک میں ہے

☆☆

maablib.org

قمر جمالی، افضال صدیقی، حنیف اخگر، اظہر عباس ہاشمی اور شیخ الجامع ڈاکٹر پیرزادہ قاسم

قمر جمالی، سحر انصاری، احمد فراز آرٹس کونسل میں

قمر جمالی، پروفیسر اعجاز فاروقی اور سیف الرحمٰن گرامی

مقابلۂ بیت بازی میں ریحانہ روحی، طالبہ اور پروفیسر اعجاز فاروقی

قمر جمالی، خورشید خاور اور شبنم صدیقی، دبستانِ مصحفی کی شعری نشست میں

آرٹس کونسل کے الیکشن میں قمر جمالی لسٹ چیک کرتے ہوئے

جدہ میں نعتیہ مشاعرہ میں صدارتی کلام سنا رہے ہیں

دبستانِ مصحفی کے مشاعرے میں فاروق عابدی، منظر ایوبی، شعیب عباسی، خورشید خاور امروہوی
غفار شاد اور قمر جمالی کلام سن رہے ہیں

پروفیسر قیصر نجفی

صحرا میں شجر

سرزمینِ امروہہ کو علم و ادب کے حوالے سے امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اس سے اہلِ علم و دانش واقف ہیں۔ ہم تو اس سرزمین کو شعر و ادب کا ایک دبستان شمار کرتے ہیں۔ امروہہ نے ایسے ایسے نابغۂ روزگار پیدا کیے ہیں، جن کی گونج خصوصاً شعر و سخن کے ایوانوں میں رہتی دنیا تک سنائی دیتی رہے گی۔ قمر جمالی کے شعور نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ اردو ادب کا ہی نہیں علمی و ادبی تناظر میں امروہہ کا عہدِ شباب تھا۔ ایسے علم پرور اور ادب نواز ماحول میں قمر جمالی کی شعری صلاحیتوں کی جس معیار پر تہذیب ہوئی، اس کی جھلک ''صحرا میں شجر'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ تپتے ہوئے صحرا میں شجر سایہ دار کا وجود فطرت کی کرشمہ کاری ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ قمر جمالی نے صحرا کو جہدِ حیات اور شجر کو شاعری کا استعارہ بنایا ہے۔ وہ جب زندگی کے صحرا میں حالات کے سورج کی تمازت سے پنجہ آزمائی کرتے ہوئے تھک جاتے ہیں تو اپنی شاعری کے شجر میں پناہ لے کر اپنے آپ کو پھر سے تازہ دم کر لیتے ہیں۔ یہ عمل گزشتہ نصف صدی سے اپنی تمام تر رنگینی و اثر آفرینی کے ساتھ تا حال جاری ہے۔ ''صحرا میں شجر'' قمر جمالی کا شعری مجموعہ ہے، جو خاصی تاخیر سے شائع ہوا ہے، تاہم دیر آید درست آید کے مصداق یہ مجموعہ اُن معدودے چند مجموعوں میں سے ایک ہے جو صحیح معنوں میں شعری مجموعے کہلانے کے مستحق ہیں۔ ''صحرا میں شجر'' کا بنیادی وصف

یہ ہے کہ اس میں شامل ہر مصرع اور ہر شعر میں شاعر کی ذات جلوہ گر نظر آتی ہے۔ جدید شعری رجحانات کے تناظر میں ذات اور شعر کے مضبوط تعلق کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ شاعر کی ذات کی جلوہ گری کے بغیر دستاویز تو وجود میں آسکتی ہے۔ ادب تشکیل نہیں پا سکتا۔ قمر جمالی کا تعلق غزل گو شعرا کے اس قبیلے سے ہے، جو غزل کی کلاسیکی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے اس کے نئے نئے امکانات ور جحانات کا کھوج لگانے میں مصروف ہیں۔ قمر جمالی فکر و اسلوب کے لحاظ سے (شعوری یا غیر شعوری طور پر) جگر مرادآبادی اور صبا اکبرآبادی سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ بعض اشعار میں تو ان کا لہجہ صبا صاحب کے لہجے سے اتنا ہم آہنگ ہے کہ تمیز کرنا مشکل ہے۔ کئی مقامات پر برجستگی و بیساختگی میں وہ اُن بزرگوں کی شدت سے یاد دلاتے ہیں۔ قمر جمالی افادی نظریہ ادب کے قائل ہیں شاعرانہ ذمہ داریوں سے کما حقہٗ آگاہ ہیں۔ انہوں نے اپنے کلام میں سعی و عمل، تسخیر و انقلاب، حیرت و استعجاب، تحرک و رجائیت اور تعمیری مثبت فکر کا اس طرح شعریاتی رویہ پیش کیا ہے کہ ہم بحیثیت ایک فنکار انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔

تیل جب تک دیئے کے اندر ہے
لو بڑھاتے رہو تو بہتر ہے

میں یہی سوچ کے بجھنے نہیں دیتا دل کو
دل جو روشن ہے تو ہر سمت اُجالا ہوگا

کہیں ایسا نہ ہو اک روز یہ شعلہ بن جائے
ایک آنسو جو مرے دیدۂ نمناک میں ہے

قمر جمالی کے یہاں خارجیت و داخلیت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے اور غزل کے حوالے سے یہ ایک نہایت نیک عمل ہے۔ ہر چند وہ اپنے کلام میں جگہ جگہ سماجی قدروں، معاشرتی رویوں، سیاسی اکھاڑ پچھاڑ، معاشی زبوں حالی، انسانی توہین اور اخلاقی زوال کی تصویر کشی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، تاہم انہوں نے تغزل کو کہیں مجروح نہیں ہونے

دیا۔ کئی ایک اشعار میں طنزیہ انداز بھی ملتا ہے، مگر طنز کو انہوں نے اپنے فکری اخلاص کی حدود سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ ''صحرا میں شجر'' میں قمر جمالی نے زیادہ تر ہجرت کے تلخ تجربات کا نہایت دُکھ بھرے لہجے میں اظہار کیا ہے گویا ماضی کی یادوں کا مرثیہ کہا ہے۔

ایک لمحے کو تو ماضی کی طرف بھی پلٹوں
میری تصویر مجھے کوئی پرانی دے دے

قمر جمالی نے کراچی کے مخدوش حالات، خونیں واقعات اور غیر یقینی صورتِ حال کا بھی بار بار رونا رویا ہے، جس کے نتیجے میں کہیں کہیں وہ فکری انتشار کا شکار ہو گئے ہیں اور طرح طرح کے خدشات، وسوسوں اور اندیشوں کا اظہار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ایک ہجرت نے تو صدیوں کا سفر روک دیا
دیس سے اب کے بھی کیا دیس نکالا ہو گا

المختصر ''صحرا میں شجر'' قمر جمالی کے حسی وجذباتی تجربوں کا ایک ایسا شعری اظہار ہے، جس میں سادگی و پُرکاری بھی ہے اور صداقت وصفائی بھی، سیاسی شعور بھی ہے اور سماجی فہم بھی، جدیدحسیت بھی ہے، اور عصری رجحانات بھی، عاشقانہ خیالات بھی ہیں اور عارفانہ افکار بھی، روایتی اسلوب بھی ہے اور جدید رنگ وآہنگ بھی...... ''صحرا میں شجر'' فنی پختگی اور شعری ریاضت کا ایک ایسا نمونہ ہے، جس کی اہمیت سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆

احمد حسین صدیقی

قمر جمالی امروہوی

مثال احمد خاں ان کا نام ہے، قمر تخلص اور قمر جمالی قلمی نام ہے۔ ۲۵ر جنوری ۱۹۲۵ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جمال احمد خاں امروہہ کے ایک معزز شخص تھے۔ قمر جمالی نے ابتدائی تعلیم خاندانی روایات کے مطابق گھر پر اپنے والد اور دادا سے حاصل کی۔ اس کے بعد امروہہ محلّہ چلّہ کے مدرسے سے حافظ ظہور الحسن چاند پوری کی شاگردی میں قرآن پاک حفظ کیا۔ پھر وہ کھیتری چلے گئے جہاں جے سنگھ ہائی اسکول میں پڑھا۔ انہوں نے آگرے سے میٹرک، ادیب اور ادیب عالم کے امتحانات پاس کیے۔ کھیتری میں مولانا محمد شفیق مرحوم، جن کی مولانا حفظ الرحمان سیوہاری سے بڑی قربت تھی، کی صحبت ملی تو طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوگئی اور شعر و سخن میں طبع آزمائی کرنے لگے۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان آگئے اور لاہور میں قیام کیا اور یہیں میکلیوڈ روڈ پر فائن آرٹ کمپنی میں ملازمت کرلی۔ کچھ عرصہ لاہور میں گزارنے کے بعد قمر صاحب کراچی آگئے اور یہاں انہوں نے ایڈورٹائزنگ کمپنی قائم کی۔ جسے آج بھی وہ بڑی کامیابی سے چلا رہے ہیں۔

قمر جمالی کی شخصیت خلوص، محبت اور عجز و انکسار سے عبارت ہے۔ ان کا سماجی شعور بڑا پختہ اور روایات کی پاسداری ان کے کردار کا حصہ ہے۔ ان کی شاعری میں اپنے

عہد کا کرب نظر آتا ہے۔ قمر جمالی صاحب سماجی کاموں میں بھی بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ کراچی کے ادبی حلقوں میں بھی وہ بڑے نمایاں نظر آتے ہیں۔ قمر جمالی صاحب کا مجموعۂ کلام ''صحرا میں شجر'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ۔

جان دیدیں گے اس چمن کے لیے
ہم نشیمن جلا کے آئے ہیں

ہم نے جو معرکۂ شام وسحر دیکھا ہے
کیا کبھی تم نے بھی اے اہلِ نظر دیکھا ہے

دوستوں کی اس قدر بھر مار ہے
دشمنوں کو ڈھونڈنا دشوار ہے

دنیا سنوار نے تجھے بھیجا تھا اے قمر
تو نے تو عاقبت بھی نہ رکھی سنوار کے

میں گفتگو کروں تو کروں کس زبان میں
اس شہر میں تو کوئی میرا ہم زباں نہیں

اس محبت میں مسلسل تو نے کھائے ہیں فریب
اے قمر پھر بھی نہ تیرے دل کی نادانی گئی

مجھ کو معلوم نہیں کون سا گھر ہے میرا
لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے ترا گھر دیکھا ہے

ایک ہی شمع وفا کا یہ کرشمہ دیکھیے
ان کی محفل میں اُجالا اور مری محفل میں آگ

"صحرا میں شجر"

آخر کار قمر جمالی کا مجموعۂ کلام "صحرا میں شجر" زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ ہی گیا۔ دیر ہی سے سہی ایک متحرک شخصیت کی شاعری اردو شعر و ادب کا حصہ تو بنی۔ محترم قمر جمالی صاحب اپنی خاندانی روایات کے پاسدار ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع، ان کی شاعرانہ حیثیت مسلم اور نکات شاعری پر ان کی گہری اور دقیق نظر کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا۔

قمر جمالی کی شاعری میں ہمیں غم حیات بھی ملتا ہے اور عشق و محبت کے جذبات بھی۔ ان کی شاعری میں ان کے دل کی آواز اشعار سے پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔ انہوں نے زندگی کے بعض حقائق کو سماجی زبان میں پیش کر کے ان کیفیات کی گہری مصوری کی ہے۔ انہوں نے زندگی کے انگنت مسائل کو ایک عام آدمی کے دکھ درد اور ایک حساس فنکار کے دل کی تڑپ کا ایک مؤثر نقشہ اپنی شاعری میں پیش کیا ہے جو پوری گہرائی سے ہر جگہ نمایاں ہے۔ اس سے پہلے کہ میں ان کی شاعری کے بارے میں کچھ عرض کروں ان کے چند اشعار کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں۔

دیکھئے حالات یہ اب اور دکھلائیں گے کیا ؟
ریزہ ریزہ ہو کے ہم یوں ہی بکھر جائیں گے کیا؟

اے قمر ہم نے گزارے ہیں جو دن اس شہر میں
کس سے پوچھیں ہم کہ وہ دن لوٹ بھی آئیں گے کیا؟

سمجھا ہے نہ سمجھے گا محبت کے معانی
وہ دل جو اسیرِ غمِ جانانہ نہیں ہے

اس سے بہتر تھا اندھیرے میں بسر کر لیتے
رات کے بعد جو انجامِ سحر دیکھا ہے
رات دن حسن کی تخلیق کیا کرتا ہوں
آپ نے کب مرا اندازِ ہنر دیکھا ہے

آپ دیکھیں گے کہ قمر نے اپنی ذات کی وہ خصوصیات یکجا کر دی ہیں جن کے مجموعے سے ان کی شخصیت کی تصویر پوری طرح کھنچ سکتی ہے۔ ان شعروں میں ان کے انفرادی و ذاتی کردار کی پوری جھلک نظر آ جاتی ہے۔ پروفیسر احتشام حسین نے غزل کے بارے میں کہا ہے۔

"غزل صدیوں سے اردو بولنے والوں کے مزاج سے ہم آہنگ رہی ہے۔ اس نے خلوت و جلوت میں ان کا ساتھ دیا ہے۔ غم اور خوشی میں انہیں یاد آئی ہے اور محبت اور نفرت کے جذبات وہ اس کے ذریعہ ظاہر کرتے رہے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ قمر جمالی کے غزلوں پر احتشام حسین کا تجزیہ پوری طرح صادق آتا ہے۔ ان کی غزلوں سے نہ صرف ان کی ذہنی و داخلی دنیا کی الجھنوں کا بلکہ انہوں نے اس کے پردے میں عصرِ حاضر کی نہ جانے کتنی پوشیدہ کروٹوں، اشاروں اور کنایوں سے ہی نہیں اکثر جگہ براہِ راست اظہار کیا ہے۔ ان کی شاعری میں فکر انگیز خیالات اور جذباتی پہلوؤں کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ قمر کی شاعری کے بارے میں زیادہ کہنا میرے لئے مناسب بھی نہیں ہے اور نہ میں خود کو اس کے لئے مکلف پاتا ہوں مگر میری ناقص رائے میں ان کی شاعری میں کیف و گداز بھی ہے، حسن و رعنائی بھی، زندگی کے نرم و نازک احساسات بھی ہیں اور غم و الم کی ترجمانی بھی۔ انہوں نے شاعری کے سرمائے میں "صحرا میں شجر" شائع کر کے قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ میں ان کے مجموعۂ کلام کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

دوستوں کی اس قدر بھرمار ہے
دشمنوں کو ڈھونڈنا دشوار ہے

اس محبت میں مسلسل تو نے کھائے ہیں فریب
اے قمر پھر بھی نہ تیرے دل کی نادانی گئی

دوستوں کا تو ذکر کیا کیجئے
دشمنوں سے بھی میری یاری ہے

maablib.org

خمار فاروقی

قمر جمالی امروہوی...... "دھیمے لہجے کا نبک رو شاعر"

"ایلیٹ کا اصرار ہے کہ اگر کسی کو اچھی شاعری پیش کرنا ہے تو اُسے چاہیے کہ اپنے تجربات کی تجسیم کرے اور انہیں خارجی جہت بھی دے جیسے کے ورجل اور ہومر نے کیا تھا" اس نظریے کی روشنی میں اگر قمر جمالی امروہوی کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو ایک ایسی تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے جس میں زندگی کے عمیق تجربات اور احساسات کی ترجمانی نے غمِ جاناں کو غمِ دوراں اور غمِ دوراں کو غمِ جاناں بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے تصویر میں زندگی کا ہر رنگ نمایاں ہے ان کی شاعری آفاقی اور دائمی قدروں کی عکاسی کرتی ہے محض موضوعاتی یا موسمی نہیں بلکہ اس میں اُن مسائل کا تذکرہ ہے جو انسان کو ازل سے درپیش ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ ان کی غزلیں فن کے تقاضوں کو پورا کرتی ہیں جن میں موسیقیت اور نغمگی پائی جاتی ہے ان کے اشعار صداقت، محبت اور اثر سے بھرپور ہیں جو کلاسیکی اور جدیدیت سے ہم آہنگ ہیں اور یہی حسن ان کی اپنی پہچان ہے جو انہیں دوسرے شعرا سے منفرد اور ممتاز کرتا

ہے۔

قمر جمالی ایک ایسے شاعر ہیں جو سب سے محبت کرتے ہیں اور عام زندگی کی طرح اشعار میں بھی بات سیدھے سادھے طریقے سے پیش کردیتے ہیں ان کی زبان اور بیان بڑا صاف ستھرا، پاکیزہ اور رواں دواں ہے وہ غزل اور اس کے مزاج دونوں سے واقف ہیں ان کی شاعری ہماری شاعری کی اس روایت سے تعلق رکھتی ہے جس کی اساس میر وغالب نے رکھی۔ حسرت، اصغر اور جگر مرادآبادی نے جسے پروان چڑھایا۔

قمر جمالی کی شاعری جذبۂ بیدار اور تمکنتِ عشق کی شاعری ہے وہ دھیمے لہجے کے سبک رو شاعر ہیں ان کی شاعری کا اسلوب اور آہنگ مدھم مدھم آنچ پر تپ کر حرف ولفظ کو شعری پیکر میں ڈھالتا ہے اور یہ اظہار ہی اصل میں ان کی شاعری اور فن کی اصل صورت ہے۔

ممکن ہے نکل آئے ادھر کوئی مسافر
صحرا میں لگاتے چلو دو چار شجر اور

یا

مجھ میں اک شخص ہم سفر کی طرح
ساتھ ہے سایۂ شجر کی طرح

وفا کی جنس دنیا میں مقدر ہی سے ملتی ہے
مقدر میں نہیں تو ہاتھ پھیلانے سے کیا حاصل

ان کے سامنے مایوسیوں کا صحرا، تمناؤں کا جنگل اور اداسیوں کا قبرستان ہے اس کے باوجود وہ تھک ہار کے بیٹھنے والے نہیں ان کا حوصلہ جوان ہے جو ہر مشکل کو سر کرنے کا مصمم ارادہ اور ہمت رکھتے ہیں وہ ہر غم سے کھیلنے کے عادی ہیں ملاحظہ فرمایئے۔

میں اپنی زندگی میں مشکلوں سے رنگ بھرتا ہوں
کوئی مشکل نہ ہو تو زندگی بے رنگ ہو جائے

یا

غموں کی بھیڑ میں جینا پڑے گا
ہمیں یہ زہر بھی پینا پڑے گا

یا

پرورش آج تلک میری ہوئی ہے جیسے
کس کو یوں گردشِ حالات نے پالا ہوگا

قمر جمالی امروہوی کی غزلوں میں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں دل کی دھڑکنیں، بے کسی کی آہیں، افسردگی کے نالے اور آہ و فغاں کے شعلے بھڑکتے اور سلگتے نظر آتے ہیں جو ان کے اپنے انداز کی ترجمانی کرتے ہیں ۔

روشنی کچھ تو ملے کچھ تو اندھیرا کم ہو
اک دیا ہم نے سرِ راہ جلا رکھا ہے

یا

تشنگی روح بجھ جائے تو مر جاتا ہے عشق
زندہ رہنے کے لیے پیاسا رہا کرتا ہوں میں

یا

لہو کتنا ہوا ہے صرف اُن سے کون پوچھے گا
مکاں تو ہو گیا تعمیر معماروں پہ کیا گزری؟

قمر جمالی **Self made** انسان ہیں ان کے اشعار اس بات کے غماز ہیں کہ انہوں نے زندگی بھر جدو جہد کی ہے دُکھ جھیلے ہیں کرب کی چادر اوڑھے وقت کی تیز دھوپ میں وقت گزارا ہے جانفشانی اور ہمت سے آگے بڑھے ہیں انہوں نے انا اور خودداری کو ٹھیس نہیں لگنے دی ہے اور زندگی بھر غموں اور تاریکیوں کے خلاف معرکہ آرائی کی ہے اُن کے خلاف سینہ سپر رہے ہیں چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں ۔

کبھی خاطر میں اُسے میں ہی نہ لایا ورنہ
غمِ دنیا تو ہمہ وقت مری تاک میں ہے

یا

یا

یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے
تری چشمِ عنایت چاہتا ہوں

قمر جمالی امروہوی کی غزلوں میں بہت سے ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جنہیں پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہیں غمِ روزگار کے ساتھ ساتھ عزیزوں اور دوستوں سے بھی شکایات رہی ہیں یہ اشعار ان کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں مگر اس طرح رقم کیے گئے ہیں کہ پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے یہ اُسی کے لیے تحریر کیے گئے ہیں ۔

دوستوں کی اس قدر بھرمار ہے
دشمنوں کا ڈھونڈنا دشوار ہے

❖❖

زہر پی لیتا ہے سچا آدمی
اور سچائی کا کیا معیار ہے

❖❖

دوستو میں تلاش کیا کرتا
میرا دشمن تو خاندان میں تھا

❖❖

میں اکثر سوچتا ہوں کیا لغزش ہوئی مجھ سے
یہ کیوں نامہرباں ہونے لگا ہے مہرباں میرا

قمر جمالی امروہوی کے کچھ اشعار جو تعارف کے محتاج نہیں میں نے اپنے مضمون کی زینت کے لیے استعمال کیے ہیں جو اپنی دلکشی، منفرد اندازِ بیان دھیمے لہجے اور سبک روی کی وجہ سے انفرادیت رکھتے ہیں ان کی کتاب 'صحرا میں شجر" سے منتخب کیے ہیں ان کی غزلوں میں روایت کے احترام کے ساتھ ساتھ جدیدیت کا رنگ بھی نظر آتا ہے ہر جذبہ اور ہر خیال تغزل میں ڈوبا ہوا ہے ان کے کلام میں لطافت اور وجدان کی کیفیت بھی ملتی ہے جدت طرازی، ترقی پسندی اور روایت پرستی کے جوہر کے علاوہ عہدِ حاضر کے تقاضے پورے

ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں جو ان کی بیباکی اور صاف گوئی کا واضح اور روشن ثبوت ہے۔

☆☆

maablib.org

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

شعور وآگہی کی مہک

آج کل ادبی کتابیں اور خاص طور پر شاعری کے مجموعے اتنی کثرت سے اشاعت پذیر ہو رہے ہیں کہ نظم ونثر کے مبتدی بھی بغل میں کئی کئی کتابیں دبائے پھرتے ہیں۔

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

بازار ادب کی اس "تیزی" کے پس منظر میں کوئی سینئر شاعر برس ہا برس کی ریاضت کے بعد جب اپنا مجموعۂ کلام کتابی صورت میں پیش کرتا ہے تو اس پر ناطق لکھنوی کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

کہہ رہا ہے شور دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

سرزمین امروہہ صدیوں سے علم وادب کا گہوارہ رہی ہے۔ یہاں ایسی ایسی نابغۂ روزگار ہستیاں پیدا ہوئیں جن کے افکار ہر دور میں لوگوں کے ذہنوں کو طہارت اور قلوب کو حرارت فراہم کرتے رہے۔ قمر جمالی کا تعلق بھی اسی مردم خیز خطے سے ہے لہٰذا ان کا قادر الکلام شاعر ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ مثل مشہور ہے مچھلی کے جائے کو تیرنا کون سکھائے۔ وہ عرصۂ دراز سے شعر کہہ رہے ہیں بقول خود" شاعری کا ذوق ابتدا ہی سے تھا اور

قمر جمالی صوبائی محتسب جناب یوسف جمال اور دیگر کے ساتھ

رضوان صدیقی، قمر جمالی، وسیم اختر اور ڈاکٹر ریحانہ شاہ

آرٹس کونسل کی جانب سے ادبی تقریب میں آغا مسعود، قمر جمالی، حسنین کاظمی، اور سید قمر رضی

شبنم صدیقی، قمر جمالی اور فیروز خسرو کلام سناتے ہوئے

سکندر صاحب اعتراف کمال کے موقع پر اپنی بنائی ہوئی تصویر قمر جمالی کو پیش کر رہے ہیں

دبستانِ مصحفی کی شعری نشست میں قمر جمالی کلام سناتے ہوئے

انجم شادانی، امیر الاسلام ہاشمی، قمر جمالی، رضوان صدیقی اور دیگر

قمر جمالی اراکین آرٹس کونسل کے ساتھ

مشاعروں میں بھی اکثر جایا کرتا تھا۔" تاہم ان کا پہلا مجموعۂ کلام "صحرا میں شجر" شائع ہوا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں شعروں کے انتخاب نے کتنا "رسوا" کیا ہوگا۔

"صحرا میں شجر" کا مطالعہ ہمیں ایک ایسے شاعر سے متعارف کراتا ہے جس کے یہاں جذبات کی فراوانی بھی ہے اور خیالات کی بلندی بھی۔ روایت بھی ہے اور درایت بھی۔ غزل کو "نیم رختی صنفِ سخن" سمجھنے والے ذرا قمر جمالی امروہوی کے یہ اشعار ملاحظہ کریں۔ ان میں محبت نئے نئے انداز سے جلوہ گر ہے جو احترام انسانی کی اولین شرط ہے۔

جو تفسیرِ محبت کر رہا ہے
حقیقت میں عبادت کر رہا ہے

❖❖

ہم نے اللہ کے بندوں سے محبت کی ہے
اس لیے لائق تعزیر نظر آتے ہیں

❖❖

جو محبت بانٹتا تھا اے قمر
وہ بھی کیا میری طرح نادار ہے

❖❖

جل رہے ہیں لوگ اب تک تو نفرتوں کی آگ میں
کیوں دلوں سے وہ محبت کی فراوانی گئی

❖❖

کوئی سمجھے تو محبت کی زباں ہے یہ بھی
آج بھی کرتا ہے لوگوں کو اشارہ پتھر

❖❖

جس سے زندہ ہے محبت کا شعور
عشق کا میں ہی تو وہ دستور ہوں

قمر جمالی جس دنیا اور جس ماحول میں رہ رہے ہیں اس کا بھرپور عکس ان کی

شاعری میں ملتا ہے۔ اسی لیے ان کے شعر کا فوری طور پر ابلاغ ہو جاتا ہے۔ ان کے یہ اشعار زندگی سے کتنے قریب نظر آتے ہیں۔

ہر سمت نفسا نفسی کا عالم ہے اے قمر
لگتا ہے اس چمن کا کوئی پاسباں نہیں

جانے میرے شہر کو کس کی نظر نے کھا لیا
رقص کرتی تھی یہاں ہر ہر نفس میں زندگی

فکر سب کو اپنے اپنے سر کی ہے
اب کسی پر سنگ برسائے گا کون

قمر جب دوستی کے تجربے سے بارہا گزرے
تو پھر یہ دن رات آئیں بنامِ دوستاں کب تک

شادمانی کے تصور سے بھی گھبرانے لگا
ایسی حالت تو نہ تھی میرے دلِ ناشاد کی

ایسا لگتا ہے ہمیں اس عہدِ پُر آشوب میں
آدمی کے ساتھ رہ کر بھی تنہا آدمی

عجیب شہر ہے یہ شہر میرے شہر کے لوگ
خود اپنے گھر کا تماشا جلا کے دیکھتے ہیں

پاکستان کی آبادی کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس نے اس کی خاطر تن، من، دھن کی بازی لگا دی تھی۔ قمر جمالی خود بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے ایک شعر میں اس کی

قربانیوں کا ذکر ان کے پُر اثر الفاظ میں کرتے ہیں ۔

پھونک کر اپنے آشیانے کو
روشنی بانٹ دی زمانے میں

اور پھر وطن عزیز کے لیے اسی طبقے کا Commitment دیکھیے۔ قمر کہتے ہیں

جان دے دیں گے اس چمن کے لیے
ہم نشیمن جلا کے آئے ہیں

قمر جمالی کے بیشتر اشعار سے ان کی سیاسی بصیرت کا پتا چلتا ہے مثلاً ۔

کوئی طوفان آنے والا ہے
اب تو سب پر یہ بات روشن ہے

◆◆

سفر میں رہزنوں کی تو فکر کیا کرتا
قدم قدم پہ مجھے خوف راہبر کا ہے

◆◆

آج کل تو ہیں سبھی بھٹکے ہوئے
کون کس کو راستہ دکھلائے گا

یہ شعر تو سیاسی ''لوٹوں'' پر سو فی صد منطبق ہوتا ہے ۔

ہم اس کو کیسے کریں اپنا راہبر تسلیم
قدم قدم پہ جو رستہ بدلنے والا ہے

اس شعر میں ''انکل سام'' کا چہرہ صاف دیکھا جا سکتا ہے ۔

اسے پاور سمجھ بیٹھی ہے دنیا
جو دنیا کی تباہی کا سبب ہے

معیاری تغزل کے ساتھ ساتھ قمر جمالی امروہوی کے کلام میں شعور و آگہی کی جو مہک ہے وہ انہیں دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے آج غزل محاکات اور معاملہ بندی سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ چشم بصیرت رکھنے والے شاعر (جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں)

اپنے قارئین کے ذہنوں کی آبیاری کر رہے ہیں "صحرا میں شجر" اس طرزِ فکر کی نمائندہ کتاب ہے جس میں عشق و عاشقی سے زیادہ حکایتِ ہستی پر زور دیا گیا ہے۔ قمرؔ بجا طور پر کہتے ہیں ۔

پردۂ شاعری میں زمانے کو ہم نے
زندگی کے فسانے سناتے رہے

☆☆☆

maablib.org

اطہر شاہ خاں جیدی

قمر جمالی ...... شجرِ سایہ دار!

اپنے بچے کا نام مثال احمد خاں رکھتے ہوئے ، والدین نے یہ سوچا بھی نہ ہو گا کہ یہ بچہ جب فہم و ادراک کا حامل ہو گا تو شاعر بنے گا اور اپنا تخلص "قمر" رکھے گا...... مثال کے لغوی معنی ہیں...... نظیر ، نمونہ ، تصویر...... اب تصویر کہیے یا عکس کہیے ، چاندنی سورج کی روشنی سے مستعار ہے اور قمر آفتاب کا ایک مثالیہ ہے ، جو روشنی کی حدت کو ٹھنڈک میں تبدیل کر کے اس کرۂ ارض پر عکس ریز ہوتا ہے۔

شاید قسمتوں کے ساتھ ساتھ تخلص اور شخصیت کے خواص بھی آسمانوں پر ترتیب دیئے جاتے ہیں ورنہ یہ عجب اتفاق نہ ہوتا کہ مثال صاحب اپنا تخلص قمر رکھتے اور ان کی کنیت بھی جمالی ہوتی اور یوں شاعری میں ایک نمایاں آواز "قمر جمالی" کے پیکر میں نغمہ سنج ہو کر ہم تک پہنچتی۔

"جمالی" سے جمالیات یعنی رنگ ، روپ اور حسن تو وابستہ ہیں ہی ، صوفیوں کی اصطلاح میں "جمالی" عالم نباتات سے مخصوص بھی ہے اور اسے بھی کیا محض اتفاق ہی سمجھا جائے کہ قمر جمالی نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام "صحرا میں شجر" رکھا...... شجر ، جو نباتات کی ارفع و اعلیٰ صورت ہے اور وہ ٹھنڈک جس میں نے پہلے ذکر کیا یہاں بھی شجر سے وابستہ ہے جسے دھوپ کی جھلسا دینے والی تمازت میں سائے کی ٹھنڈک میسر آ جائے ، یہ ٹھنڈک ، یہ شائستگی اور

یہ دھیما پن ہمیں قمر جمالی کی پوری شاعری میں جاری وساری نظر آتے ہیں۔

قمر جمالی علم و حکمت کے اس خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جو اعلیٰ معاشرتی و تہذیبی اقدار کا حامل تھا اور یہی قدریں ان کی شاعری کے پیرہن کی خوشبو ہیں۔

میرے اجداد سے ورثے میں ملا ہے جو مجھے
بس وہی رنگ ابھی تک مری پوشاک میں ہے

قمر جمالی ہم عصر شاعری کے قدم بہ قدم جدید لہجے کے شاعر ہیں لیکن انہوں نے جدت کی بنیادوں پر جو عمارت تعمیر کی ہے اس کے ہر دریچے سے روایت کی دوشیزہ جھانکتی نظر آتی ہے...... اس کا حسن زہد شکن تو یقیناً ہو سکتا ہے، جدت شکن ہرگز نہیں ہے۔ قمر جمالی دوشیزۂ روایت سے رسم و راہ رکھتے ہوئے بھی جدید حسیت اور تازہ کاری سے غافل نظر نہیں آتے، آلام و حوادث نے انہیں ابتدا میں ایسے چاک پر رکھا جہاں تشکیل پانے والا کوزہ تجربوں کی بھٹی سے گزر جائے تو سفال خام نہیں رہتا اور گزرتے گزرتے ٹوٹ جائے تو اسی مٹی میں مل جاتا ہے جس سے اسے گوندھا گیا تھا، یہ قمر جمالی کی سخت جانی تھی کہ وہ اس بھٹی کی حدت سے گزر گئے اور اس آنچ کی کسک اپنی شاعری میں سمو گئے۔

کوئی دیکھے تو ہمارے سوزِ گریہ کا فروغ
سینۂ دریا میں موتی، دامنِ ساحل میں آگ

دلِ دردمند رکھنے کے باعث قمر جمالی اپنے ماحول کا اثر روح کی گہرائی تک محسوس کرتے ہیں اور یوں ان کی شاعری کی پلکیں نم ہو جاتی ہے۔

شہر مقتل بنا ہوا ہے مگر
ہر طرف بج رہی ہے شہنائی

❖❖❖

کیوں نہیں کرتے ہیں دونوں مل کے دشمن کی تلاش
بھائی سے یہ بھائی لڑ کر یوں ہی مر جائیں گے کیا

قمر جمالی کی شاعری صرف شہر آشوب اور گریہ لمحہ موجود ہی نہیں اس میں حسن کی رعنائیاں اور عشق کی سرمستیاں بھی ہیں۔

مدتوں خوشبوئے یار آئی بہت
جس نے میری روح مہکائی بہت
غم ہزاروں ہوں تو اس کا غم نہیں
صرف اس کی ایک انگڑائی بہت

اردو شاعری میں لفظیات کا موضوع ایسا ہے جس پر بہت کچھ لکھا گیا اور بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، روایت میں جہاں...... شمع، پروانہ، آشیانہ وغیرہ کثرت سے نظر آتے ہیں وہیں ہم عصر شاعری میں آئینہ، دیوار، زنجیر، سائبان وغیرہ کی بہتات ہے لیکن قمر جمالی کی شعری لفظیات میں "سفر" ایک ایسا لفظ ہے جس نے جدید لہجے اور فکر سے ہم آہنگ ہو کر اس ایک لفظ کو بہت سے اشعار میں وہ صورت دی ہے جس کے بارے میں آتش نے کہا تھا۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

قمر جمالی کے ہاں "سفر" ہجرت کا ایک استعارہ بھی ہے اور منزل کو پالینے کی جستجو کا اشارہ بھی۔

قدم آگے بڑھا، منزل تجھے آواز دیتی ہے
سفر میں ہے تو یہ اندیشۂ سود و زیاں کب تک

◆◆

کس مسافر کو یہ اندازہ ہوا اب تک
کتنا سامان ضروری ہے سفر سے پہلے

◆◆

میں تو تنہا چلا تھا رہِ شوق میں
گرہی کیوں شریکِ سفر ہو گئی

◆◆

فکرِ منزل ہے سفر سے پہلے
کبھی نکلے بھی ہو گھر سے پہلے

قمر جمالی کا سفر کتنا ہی طویل اور صبر آزما کیوں نہ ہو، ان کی منزل کے لئے راہ کا ہر سنگِ میل محبت اور احترامِ آدمیت کی تمثیل ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اچھی شاعری کے لئے اچھا انسان ہونا بھی ضروری ہے اور جب قمر جمالی سے ملاقات ہوئی تو وہ اپنے دھیمے لہجے اور اخلاق و شائستگی میں اپنے اس شعر کی مجسم تفسیر نظر آتے ہیں۔

شرط یہ ہے آدمیت کے تقدس کے لئے
آدمی انسان بھی آدمی کے ساتھ ساتھ

☆☆

maablib.org

جمال نقوی

صحرا میں شجر لگانے والا...... قمر جمالی

معروف مغربی ادیب ودانش ور ڈی ایس ایلیٹ ایک فنکار کی زندگی اور اس کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے:

"ہر فن کار میں دو وجود ہوتے ہیں۔ ایک جو زندگی کی آزمائش وابتلا سے گزر رہا ہے اور دوسرا جو تخلیق کے عمل میں مصروف ہے"

"صحرا میں شجر" کے خالق اور دبستانِ مصحفی کے معروف شاعر مثال احمد خاں قمر جمالی ایسے ہی دو وجود کی یکجائی کا بہترین نمونہ ہیں۔ سماجی اور سیاسی زندگی کے نشیب وفراز سے گزرنے کے ساتھ ہی انہوں نے اجداد سے ملے ہوئے ورثے کے شعری رنگ اور سماجی ڈھنگ کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی۔ اس کوشش میں شفق امروہوی، عزیز وارثی اور انجم فوقی نے ان کی مدد اور رہنمائی کی۔ اس سلسلے میں شعری اعتراف دیکھئے:

میرے اجداد سے ورثے میں ملا ہے جو مجھے
بس وہی رنگ ابھی تک مری پوشاک میں ہے

اور یہ رنگ انہیں دبستانِ مصحفی خاکِ امروہہ کی عطا ہے جس کا اظہار انہوں نے اسی غزل کے ایک دوسرے شعر میں یوں کیا ہے۔

وہ مرے فن میں جداگانہ مہک رکھتی ہے
خاکِ امروہہ کی خوشبو جو مری خاک میں ہے

خاکِ امروہہ کی خوشبو کے کچھ اور رنگ دیکھنے کے لئے جب ہم ''صحرا میں شجر'' لگانے والے کے کلام اور اسلوب بیان کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ قمر جمالی مشرقی تہذیب کی یادگار، منکسر المزاج اور پُر وقار شخصیت کے حامل ایک قادر الکلام شاعر ہیں، جنہوں نے غزل کے پیرائے میں اپنے سماجی، سیاسی، اصلاحی اور فلاحی شعور کا اظہار بہت خوبصورتی سے کیا ہے۔ آیئے ''صحرا میں شجر'' پر کھلنے والے پھولوں کی خوشبو سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

ممکن ہے نکل آئے ادھر کوئی مسافر
صحرا میں لگاتے چلو دو چار شجر اور

◈◈

قدم آگے بڑھا منزل تجھے آواز دیتی ہے
سفر میں ہے تو یہ اندیشۂ سود و زیاں کب تک

◈◈

کون کہتا ہے کہ تھک کر چور ہوں
فخر ہے میرا کہ میں مزدور ہوں

◈◈

مانا کہ اسیرِ رسن و دار رہوں گا
ظالم سے مگر برسرِ پیکار رہوں گا

◈◈

قمر ہم اس کے لئے اپنی جان دیدیں گے
جو آنچ آئی کبھی پرچمِ ہلالی پہ

''صحرا میں شجر'' قمر جمالی کے شعری مجموعے کا نام ہی نہیں بلکہ ان کی صبر آزما اور مجاہدانہ زندگی کی علامت بھی ہے جو استقامت حوصلا ... عبا ... ے ا حس

کا درس انہوں نے اپنی اولاد کو بھی دیا ہے اور اپنے شعروں کے ذریعہ اپنے قاری کو بھی دیا ہے۔جس کی طرف علامہ اقبال نے بھی اشارہ کیا ہے کہ "عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی" اور قمر جمالی کہتے ہیں ۔

جو ہواؤں کی زد پہ ہیں روشن
ہم نے ایسے دیئے جلائے ہیں

مسکراتا ہوا میں ان سے گزر جاتا ہوں
جو مسائل مجھے گھمبیر نظر آتے ہیں

اس پہ کھلتا ہے زندگی کیا ہے
جو یقین و گمان سے گزرے

وہ زندگی میں کبھی ہار کر نہیں بیٹھے
جو حادثات کو آنکھیں ملا کے دیکھتے ہیں

مصائب تو بہت تھے زندگی میں
قمر ہم نے کبھی ہمت نہیں ہاری

روایت کی پاسداری کے ساتھ بھی قمر جمالی نے عصر حاضر کے سماجی اور سیاسی مسائل کو بھی اپنی غزل میں پیش کیا ہے۔ کیونکہ جو ادیب وشاعر اعلیٰ سماجی اقدار کو بہت عزیز رکھتا ہے اس کی تخلیقات میں زندگی کے سنجیدہ مسائل اور موضوعات کا فنکارانہ اظہار ملتا ہے۔ اس طرح وہ تخلیق کار اپنے قلم کی توانائی اصلاح معاشرہ کے لئے صرف کرتا ہے اور یہ کچھ قمر جمالی کی شعری تخلیقات میں نظر آتا ہے۔

ایک ہجرت نے تو صدیوں کا سفر روک دیا
دیس سے اب کے بھی کیا دیس نکالا ہوگا

ہم نے اس کو بھی بجھا کر رکھ دیا
جس دیئے سے روشنی پائی بہت

❖❖

خود کو سورج کی تمازت سے بچانے کے لئے
سائے سے لپٹی ہوئی ہے آج کل دیوار بھی

❖❖

قیامت ہے کہ اب اک دوسرے سے
جسے دیکھو وہ نفرت کر رہا ہے

❖❖

ہمیشہ جس نے دکھ ملت کو بانٹے
وہ ملت کی قیادت کر رہا ہے

❖❖

بہت بڑھنے لگی ہے بے قراری
بدل ڈالو نظامِ شہر یاری

❖❖

شہر مقتل بنا ہوا ہے ، مگر
ہر طرف بج رہی ہے شہنائی

قمر جمالی خوش قسمت ہیں کہ خدائے بزرگ و برتر نے ان کی دعا قبول کی اور انہیں عرفانِ ذات اوران کے لفظوں کو تاثر عطا ہوا۔ اور انہیں روشنی کی کرن نظر آئی ۔

وہ مجھے ذات کا عرفان عطا کر یارب
جو مری منزلِ دشوار کو آساں کر دے

❖❖

میرے اشکوں میں وہ تاثیر بھی رکھدے یارب
جیسے ہوتی ہے دعاؤں میں اثر کی قسمت

دل جو روشن ہوا قمرؔ تو مجھے
ہر طرف روشنی نظر آئی

☆☆☆

maablib.org

مسرور جاوید
ناروے

قمر جمالی......روائتوں کا جدید شاعر

اردو زبان آوازوں کا سمندر ہے۔اس میں خیال کے بولتے رنگوں اور احساس کی ناطق صورتوں کی جو موجیں ملتی ہیں وہ اپنے تصادم، ترنم اور تسلسل سے صوت وصدا کا جادو جگاتی رہتی ہیں۔قمر جمالی کی شاعری میں ہمیں ان آوازوں کی بازگشت بھی ملتی ہے اور ذاتی تجربے کی بعض رواں دواں کیفیتوں کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ان کی تحریری صدا بندی میں وقت کی صورت گری بھی نظر آتی ہے۔ان کی شاعری احساسات سے وابستہ رہی ہے۔ہجرت کے کرب کا تجربہ، اقدار کی بے حرمتی، سماجی ناانصافی اور اجتماعی بے بسی نے زوال فکر کے جو اسباب فراہم کیے ہیں اس کا اظہار ان کے اشعار میں جا بجا ملتا ہے۔مثلاً ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

وہاں سب میرے اپنے تھے کبھی گھر تھا جہاں میرا
نہ اب وہ شہر میرا ہے نہ اب وہ آشیاں میرا

میں تیرے شہر میں کیسے کسی سے گفتگو کرتا
نہ کوئی ہم سخن میرا نہ کوئی ہم زباں میرا

ان کا فن شاعری صرف ذاتی تجربات اور مشاہدات کا ہی ترجمان نہیں ہے بلکہ

اپنے عہد کی سچائیوں اور تلخیوں کا بھی آئینہ دار ہے۔ ہجرت کے بعد اقدار کی شکست وریخت کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو ریزہ ریزہ محسوس کیا اور بیباکی اظہار کچھ یوں کیا کہ۔

ایک ہجرت نے تو صدیوں کا سفر روک دیا
دیس سے اب کے بھی کیا دیس نکالا ہوگا

یا قمر جمالی فرماتے ہیں کہ۔

جان دیدیں گے اس چمن کے لئے
ہم نشیمن جلا کے آئے ہیں
جو ہواؤں کی زد پہ ہیں روشن
ہم نے ایسے دیئے جلائے ہیں

قمر جمالی نے زندگی کے سرد و گرم دیکھے ہی نہیں بلکہ انہیں بسر بھی کیا ہے۔ انہوں نے زندگی کو برتا بھی ہے اور اس پر غور وفکر بھی کیا ہے۔ احساس وخیال کی اس یکجائی نے ان کے اشعار میں رنگ و آہنگ کے ساتھ ساتھ اثر و تاثیر بھی پیدا کر دیئے ہیں۔ ان کے ہاں معاملہ بندی سے لے کر غم روزگار تک سب کچھ ملتا ہے۔ وہ بلاشبہ اردو ادب کے گیسو سنوارنے میں مصروف ہیں ان کی شاعری میں جہاں روایت کا فنی حسن جلوہ گر ہے وہاں جدید عوامل بھی اپنی تمام تر صداقتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ چنانچہ قدیم وجدید کے باہمی اشتراک سے ان کی شاعری کا خمیر اٹھا ہے۔ ثبوت کے طور پر ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

میرے اجداد سے ورثہ میں ملا ہے جو مجھے
بس وہی رنگ ابھی تک میری پوشاک میں ہے

یا

ممکن ہے نکل آئے ادھر کوئی مسافر
صحرا میں لگاتے چلو دو چار شجر اور

ان کا ایک اور خوبصورت شعر ملاحظہ فرمائیں۔

تشنگی روح بجھ جائے تو مرجاتا ہے عشق
زندہ رہنے کے لئے پیاسا رہا کرتا ہوں میں

لیکن اب ان کا جدید لہجے پر مشتمل یہ شعر ملاحظہ فرمائیے جو ادب کے پروانوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے کہ ۔

خود کو سورج کی تمازت سے بچانے کے لئے
سائے سے لپٹی ہوئی آج کل دیوار بھی

یا

تیل جب دیئے کے اندر ہے
لو بڑھاتے رہو تو بہتر ہے

لہٰذا قمر جمالی گفتگو میں سکوت اور سکوت میں گفتگو کے انداز پیدا کرنے پر عجیب قدرت رکھتے ہیں۔ ہجرت میں پاش پاش ہونے کے باوجود انہوں نے جسم و روح کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے ان گنت دکھوں کو برداشت کیا لیکن پھر بھی ان کے مزاج میں یاسیت یا قنوطیت کے بجائے حوصلہ اور دلیری آتی گئی ۔ وہ تیز دھوپ میں بھی گھنے سایوں کا تصور رکھتے ہیں۔ وہ عصرِ حاضر کے حسن وقبیح کا جائزہ لے کر ظرف انسانی اور قلب بشر کو انسان دوستی اور قدرِ آدمیت کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں ایک شفیق باپ، محبت کرنے والے شوہر اور انسان دوست ہونے کا شعور کارفرما ہے۔ ان کے اشعار سے صحیح معنوں میں ادبی جمالیاتی قدریں نکھرتی ہیں۔ پھر ان میں خیالات کی ترتیب، تسلسل اور ان کے ارتقاء کا لحاظ قمر جمالی کو ایک پختہ کار شاعر کی صورت میں سامنے لاتا ہے۔ مثلاً ان کے فن کا اندازہ اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۔

کوئی دیکھے تو ہمارے سوزِ گریہ کا فروغ
سینۂ دریا میں موتی دامنِ ساحل میں آگ

آج کے دور میں ہمارا ادیب ہمارا شاعر لکھنے میں اس قدر مصروف ہے کہ اسے پڑھنے کی فرصت نہیں ہے لہٰذا مطالعے کے بغیر تخلیق کردہ کتب جو شائع ہو رہی ہیں بقول ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے کہ وہ ہاتھوں ہاتھ دی تو جا رہی ہیں لیکن ہاتھوں ہاتھ لی نہیں جا رہی ہیں۔ لیکن قمر جمالی کا مجموعۂ کلام ''صحرا میں شجر'' دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا رشتہ کتاب اور اس کے مطالعے سے تسلسل کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ اسی لیے وہ معاشرتی، سیاسی

اور سماجی مسائل کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھتے ہیں اور طبقاتی کشمکش اور عدم مساوات کا ادراک بھی رکھتے ہیں۔ حسین لفظی پیکروں اور جاندار اشعاروں کی مدد سے وہ اکثر چونکا دینے والے اشعار کہہ جاتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر دیکھیں کہ۔

سر چھپانے کوئی کہاں جائے
دھوپ جب سائبان سے گزرے

انہوں نے جہاں قدیم ادبی روایتوں سے استفادہ کیا اور اپنا رشتہ کلاسیکی ادب سے برقرار رکھا ہے وہاں خود کو زندگی اور فن کے جدید سانچوں میں بھی ڈھالا یہی وجہ ہے کہ راقم الحروف نے انہیں روایتوں کا جدید شاعر کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ ''صحرا میں شجر'' شعری ادب میں بہار کی تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔ میری دعا ہے کہ ان کی شاعری ہمارے معاشرے کو اسی طرح مہکاتی رہے اور ہم سب ان کی طویل عمری اور صحتیابی کے لئے دعا کرتے رہیں۔

☆☆☆

جاوید منظر

قمر جمالی صحرا میں شجر اُگانا جانتے ہیں

قمر جمالی کو اشعار میں اظہار کا فن آتا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "صحرا میں شجر" میرے اس خیال کی بھرپور اعکاسی کرتا ہے۔

قمر جمالی امروہہ کے مردم خیز خطہ سے تعلق رکھتے ہیں یہ حقیقت ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں امروہہ کا نام سنہری حروف سے لکھا جائے گا جس نے نسیم امروہوی، رئیس امروہوی، احسان امروہوی، حیات امروہوی، کمال امروہوی، ساقی امروہوی، ہوش امروہوی، جون ایلیا اور قمر جمالی امروہوی جیسے شاعر و ادیب پیدا کئے۔

قمر جمالی نئے دور کے نغمہ سرا ہیں اور کیوں نہ ہوں جبکہ دورِ جدید کو انہوں اپنے شعروں سے زندگی بخشی۔ خاموش فلموں سے لے کر کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور ای میل سروس تک قمر جمالی نے زندگی کو ہر رخ سے شب و روز میں ڈھلتے ہوئے دیکھا ہے۔

"صحرا میں شجر" کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ قمر جمالی نے اپنے تجربات اور احساسات کو اشعار کے قالب میں ڈھالتے ہوئے الفاظ کو ان کی حقیقی جزیات کے جلو میں لے کر چلنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ الفاظ کو برتنا اور بات ہے اور الفاظ کی روح میں اُتر کر اشعار میں سمونا الگ بات جو ناممکن کو ممکن بنانے کے مترادف

ہے۔

ایں سعادت بہ زورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

قمر جمالی کو اس شعری سفر میں خوبصورت وادیوں سے بھی گزرنا پڑا اور غم واندوہ کے پہاڑوں کو بھی ثابت قدمی سے عبور کرنا پڑا اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اسی تناظر میں قمر جمالی یہ شعر تخلیق کرتے ہیں۔

دیکھئے حالات یہ اب اور دکھلائیں گے کیا ؟
ریزہ ریزہ ہو کے ہم یوں ہی بکھر جائیں گے کیا؟

مندرجہ بالا خیالات کی روشنی میں، میں یہ لکھنے میں حق بجانب ہوں کہ قمر جمالی صحرا میں شجر اُگانا جانتے ہیں اور یہ اگر یوں ہی صحرا میں شجر کاری کرتے رہے تو ان بے آب و گیاہ علاقوں کو سرسبز و شاداب وادیوں میں بدل دیں گے۔

☆☆☆

پروفیسر فاروق فیصل

ایک ہمہ شخصیت...... قمر جمالی

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جن معاشروں میں اہلِ علم وادب کی توقیر نہیں کی جاتی ان میں علم کے چشمے کبھی جاری نہیں رہتے۔ ہمارا یہ المیہ ہے کہ ہم اداکاروں، کھلاڑیوں، سرمایہ داروں، صنعتکاروں اور سیاستدانوں کو تو سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر نوازتے ہیں۔ لیکن ان ہستیوں کی تعریف وستائش میں ہمیشہ بخل سے کام لیتے ہیں۔ جنہوں نے اپنی شبانہ روز محنتوں اور کاوشوں سے علم وادب کے چراغ روشن کئے ہوئے ہیں۔ اور نسلِ انسانی کو تہذیب وتمدن عطا کیا ہوتا ہے۔

محترم قمر جمالی ایک ہمہ گیر شخصیت کے حامل ہیں۔ انہیں علم وادب کی دنیا میں عزت واحترام اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ادبی گروہ بندیوں اور اہلِ قلم کی باہمی چپقلشوں سے بے نیاز، نہایت خاموشی سے برسوں سے شعر وسخن کی تخلیق میں مصروف ہیں۔ نہایت خوش اخلاق، ملنسار اور بے حد مخلص انسان ہیں، شائستگی، شرافت اور وضعداری ان کے کردار کے نمایاں پہلو ہیں۔

قمر جمالی صاحب کے کلام پر ان کی شخصیت کی گہری چھاپ ہے۔ وہ جس طرح اپنے معاشرتی اور تہذیبی معاملات میں نڈر، بے باک اور جرأت کا پیکر دکھائی دیتے ہیں۔

اسی طرح اظہار فن اور جذبہ و احساس میں بھی نہایت سچے اور کھرے ہیں۔ ان کا ظاہر اور باطن ایک ہے۔ جیسے وہ کہتے ہیں کہ ۔

میں دنیا سے محبت چاہتا ہوں
وقار آدمیت چاہتا ہوں
سخن میں دل لہو کرتا ہوں اپنا!
میں کب دنیا سے قیمت چاہتا ہوں

چمن پر کیا ہمارا حق نہیں ہے اے چمن والو
جلائے جائیں گے آخر ہمارے آشیاں کب تک

جمالی صاحب کی تخلیقات کا مطالعہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ برسوں کی جدو جہد کے گرم خولحات میں انہوں نے بلند و پست مقامات کا خیال رکھا ہے اور تب و تاب پیہم کے نتیجے میں حاصل ہونے والی طمانیت میں انہوں نے جرأت و آگہی کا واضح رخ متعین کیا ہے۔

جیسے!۔

نشیمن ہی نہیں ہم بھی جلیں گے آگ برسے گی
ہمیں معلوم ہے اب کے بہار آنے سے کیا ہوگا

جمالی صاحب کا کلام ان کے مسلک شعر کے عین مطابق ہے۔ وہ زندگی کو بہتر بنانے، سنوارنے اور نکھارنے کا ایک ایسا عزم اور جذبہ رکھتے ہیں جس میں پورا معاشرہ خوشگوار زندگی کا ضامن ہو، عدل و انصاف ہو، صحت مند اقدار کو فروغ حاصل ہو۔ معاشرہ جبر و تشدد، ظلم و استحصال سے پاک ہو اور عظمت انسانی کا آئینہ دار ہو۔

جمیل الدین فریدی

قمر جمالی کا شعورِ شاعری

جناب قمر جمالی صاحب کا شعری مجموعہ "صحرا میں شجر" اشاعت پذیر ہو کر منظرِ عام پر آیا، شعر و سخن کے سرمایہ میں ایک نیا اضافہ ہوا۔

قمر امالی صاحب جس طرح عمومی زندگی میں ایک خلیق و با مروت، پیکرِ شرافت اور منکسر المزاج انسان ہیں۔ بحیثیت شاعر بھی "حلقۂ یاراں" میں ایک جانی پہچانی اور نمایاں شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی شاعری بڑی جاندار اور پُر اثر ہے۔ ظاہری و معنوی اعتبار سے آراستہ ہے۔ کیوں نہ ہو؟ قمر جمالی دبستانِ مصحفی کے متصف و منتخب و خوشہ چیں جو ٹھہرے! اقلیم سخن کے تاجدار استادوں کے استاد مصحفی امروہوی کے نام نامی کی لاج تو آخر رکھنی تھی۔ پھر نابغۂ روزگار حضرت انجم فوقی بدایونی جیسی مقتدر شخصیت سے شرف تلمذ رکھنا بھی کچھ کم سعادت نہیں ۔

جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد

کسی شاعر کے کلام پر اظہار خیال یا رائے زنی کرنا بلا شبہ ہر شخص کا کام نہیں۔ خصوصاً اس کے لئے جو خود شاعر نہ ہو۔ ایسا ہی ہے جیسے مذہب سے بیگانہ کوئی شخص بزعم باطل کسی عالم دین کے علم و فضیلت پر بے سود بحث کرے۔ قمر مالی صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں پر بھی قلم اُٹھانا

اپنا مقصود ہے نہ منصب۔ یہ ناقدین فن ہی کا حق ہے۔ لیکن قمر جمالی کے روپ میں جب کوئی فرد اپنی شاعرانہ شخصیت کا کھل کر اظہار کرے اور شعر گوئی کے فن میں اپنی بھرپور پہچان کرائے...... پہچان بھی ایسی کہ قاری کے ذہن و دل پر ایک کسک چھوڑ جائے...... یا بالفاظ دیگر ''مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید'' والی صورتِ حال درپیش ہو، تو ایک عام قاری کی حیثیت سے اعتراف صداقت کرنا ہی پڑتا ہے۔ انسان کا یہ اخلاقی و ادبی فرض بن جاتا ہے۔ یوں بھی کسی ادیب و شاعر کی قلمی خدمات اور علمی کاوشوں کو بلا جواز مسترد کرنا کوئی پسندیدہ عمل یا شریفانہ بات نہیں۔

''صحرا میں شجر'' کے خالق قمر جمالی صاحب نہ زود گوئی کے قائل ہیں اور نہ بے معنی وغیر معیاری شعروں کی بھرمار کے رسیا۔ ان کا شعری مسلک ''شعر گفتن برائے گفتن'' نہیں۔ سکّے چند ہوں مگر کھرے اور کھنکناتے ہوں ان کا عقیدہ ہے۔ قمر جمالی کا اسلوبِ شاعری سیدھے سادھے پیرائے مگر دل گداز انداز میں زندگی کے تجربات و مشاہدات اور قلبی واردات کا بیان ہے۔ نہ وہ الفاظ کی غیر ضروری مرصع سازی کو پسند کرتے ہیں نہ حشو وزائید کو منہ لگاتے ہیں۔ اردو زبان کی سادگی و صفائی کے ساتھ بڑی عمدگی اور خوش اسلوبی سے نہ صرف انہوں نے غزل کی قدیم روایت کو قائم رکھا ہے، ایک پختہ کار غزل گو شاعر کی حیثیت سے تغزل کے تمام تقاضوں اور اس کے لوازمات کو بھی خوب نبھایا ہے۔

کہا جاتا ہے شاعری کی زبان دل کی زبان ہوتی ہے۔ قمر جمالی بھی جو کچھ محسوس کرتے ہیں۔ ان کے دل میں جو بات اُترتی ہے، سچے دلی جذبات کے ساتھ شعر کے خوبصورت قالب میں ڈھال دیتے ہیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ تخیل کی بلند پروازی سونے پہ سہاگہ ہے۔ مسائلِ ذات ہوں کہ حیات یا عشق و نیاز کے معاملات، بڑی خوبی سے طبع آزمائی اور دلوں کی جوت جگائی ہے امنگ بھرے ولولوں کے ساتھ۔ کہ شعر سننے والا، شاعر کا جوہر پرکھ کے، پہلے سے زیادہ متوجہ ہو کے، ذرا سنبھل کر بیٹھ جاتا ہے۔

مندرجہ ذیل چند متفرق اشعار بطور نمونہ مشتے از خروارے، نذرِ قارئین ہیں جو شاعر کی پختہ کاری کا ثبوت ہی نہیں، اس بات کی ضمانت بھی ہیں کہ قمر جمالی کا مجموعۂ کلام علم و ادب کے قدر دان شائقین میں قبولِ عام حاصل کرے گا۔

جب کسی امتحان سے گزرے
ہم بڑی آن بان سے گزرے
سر چھپانے کوئی کہاں جائے
دھوپ جب سائبان سے گزرے

اے قمر زندگی کا ہر لمحہ
زندگی کی اساس ہوتا ہے

اپنے بھی بیگانے ہیں
شاید ہم دیوانے ہیں
ذکر وفا کا مت چھیڑو
سب جانے پہچانے ہیں
آئیں وہ شمشیر بکف
ہم بھی سینہ تانے ہیں

ستم شرمندۂ ذوق ستم ہوگا تو کیا ہوگا
زمانہ شامل ارباب غم ہوگا تو کیا ہوگا
میں یہی سوچ کے بجھنے نہیں دیتا دل کو
دل جو روشن ہے تو ہر سمت اُجالا ہوگا

ممکن ہے نکل آئے ادھر کوئی مسافر
صحرا میں لگاتے چلو دو چار شجر اور

کوئی دیکھے تو ہمارے سوز گریہ کا فروغ
سینۂ دریا میں موتی، دامن ساحل میں آگ

ناخداؤں سے یہ طوفان سمیٹا نہ گیا
ورنہ طوفان سمٹتا تو کنارہ ہوتا

ایک نیا انقلاب آتا ہے
لوگ جب ٹوٹ کر بکھرتے ہیں

وہ اپنے آپ سے نا آشنا ہے
جو دنیا کی شکایت کر رہا ہے

فکرِ منزل ہے سفر سے پہلے
کبھی نکلے بھی ہو گھر سے پہلے
کس مسافر کو یہ اندازہ ہوا ہے اب تک
کتنا سامان ضروری ہے سفر سے پہلے

چمن پر کیا ہمارا حق نہیں ہے اے چمن والو
جلائیں جائیں گے آخر ہمارے آشیاں کب تک

نشیمن ہی نہیں، ہم بھی جلیں گے، آگ برسے گی
ہمیں معلوم ہے اب کے بہار آنے پہ کیا ہوگا

اس سے بہتر تھا اندھیروں میں بسر کر لیتے
رات کے بعد جو انجام سحر دیکھا ہے

جواز دے دیں گے اس چمن کے لئے
ہم نشیمن جلا کے آئے ہیں

نفرتوں کی آندھیوں کا ابھی زور کم نہیں
تیور بتا رہے ہیں یہ گرد و غبار کے

◆◆◆

ہم نے اللہ کے بندوں سے محبت کی ہے
اس لئے لائق تعزیر نظر آتے ہیں

☆☆

نگار فاروقی

روایت اور تہذیب کا امین شاعر...... قمر جمالی

شاعری نبوت نہیں ہے، جس کا دروازہ ہمیشہ کے بند ہو چکا ہے۔ شاعری کا دروازہ تو ہمیشہ کے لئے کھلا ہوا ہے۔ ولی دکنی نے کہا تھا کہ۔

راہ مضمون تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے باب سخن

مولانا حالی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے غزل کو فرسودہ روایات سے نجات دلا کر اُسے نئی ڈگر پر ڈالا اور غزل کے موضوعات کو وسعت دی۔ زمانہ ماقبل تاریخ انسان تہذیب وتمدن سے نا آشنا سہی لیکن شاعری سے ضرور آشنا تھا۔ شاعری کیا ہے اور یہ کن چیزوں کا تقاضا کرتی ہے اس سلسلہ میں زمانہ قدیم سے اب تک بہت سی باتیں کہی گئیں ہیں جہاں تک میری معلومات میں ہے کہ شاعری نے سب سے پہلے جنم لیا، نثر کا وجود بہت بعد کی بات ہے یہاں تک کہ زمانہ قدیم کا انسان عبادت بھی شاعری کی زبان میں کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہے۔ ویسے ہر دور میں اپنے اپنے عصری تقاضوں کو سامنے رکھ کر دانشور نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ارسطو نے بوطیقا میں اپنے عہد کے مطابق ادب کی قدروں پر بحث کی اور ان کا تعین کیا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ادب کی قدریں بھی بدلتی

رہتی ہیں کیونکہ مشروط اور پابند ادب زندہ ادب کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ کلاسیکیت اور جدیدیت کے امتزاج سے ایک نئے ادب کی شکل ابھرتی ہے ذات اور زبان کا دائرہ ماضی کے حوالوں ہی سے وسعت حاصل کرتا ہے کیونکہ اس کے بغیر عصری تقاضے کسی ادب کے پورے نہیں ہوتے۔ زندہ ادب کے لئے لازم ہے کہ اس میں زندگی کے مطالعہ اور روایات کا عکس پوری توانائی کے ساتھ ملتا ہو۔ ایسی شاعری ہی فطری کہلاتی ہے جو ہر دور میں لوگوں کے دل کی دھڑکن بن جائے۔ ہر دور اپنی شاعری کے اصول وفن ادب کی قدریں خود قائم کرتا ہے۔ غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا گیا ہے یہ حقیقت بھی ہے غزل میں جدید دور کی عکاسی ضرور ہونی چاہیے لیکن اس کے لئے غزل کا حلیہ بگاڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پرانے شاعروں کی غزلیں بھی اپنی تہذیب اور تمدن کی ترجمان رہی ہیں۔ آج کل شاعروں کی ایک جماعت وہ ہے جو اپنے آپ کو جدید غزل کا جدید نمائندہ سمجھتی ہے اس قسم کے شعرا پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں موجود ہیں ان کی غزلیں شاعری کی معمولی سے معمولی تعریف پر پوری نہ اترنے کے باوجود دونوں ملکوں کے بہترین رسالوں میں شائع ہو رہی ہیں اور ہمارے بعض نقادان کی شاعری کا حوالہ بھی اپنی تحریروں میں دینے لگے ہیں جو شاعری کے شین سے بھی واقف نہیں ہے۔ یہ صورت حال ان کی فتح ضرور ہے اس پر ان شاعروں کو جتنا مبارک باد دی جائے کم ہے۔ آج کل بیشمار مجموعے آرہے ہیں جن شاعروں کی شاعری کی عمر تین چار سال بھی نہیں ہے ان کے مجموعے موجود ہیں ان پر معقول لکھنے والے نقادوں کی رائے بھی، ان کے مجموعوں کا یہ حال ہے سینئر شعرا کے پورے پورے مصرعے اور پورے پورے شعر جوں کے توں موجود ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے فخر محسوس ہو رہا ہے کہ قمر جمالی نے نصف صدی کا شعری سفر طے کیا۔ کھلی آنکھوں سے اپنے عہد کو دیکھا اور دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا۔ آنکھ کھولی تو امروہہ جیسے شہر میں جہاں ہر طرف شعر و شاعری کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔

امروہہ برصغیر میں ایسا شہر ہے کہ جہاں ہر دور میں بڑے بڑے صاحب بصیرت اور صاحب علم دنیا سے اپنا لوہا منواتے رہے۔ شاعری میں بھی شیخ مبارک فضل اور فیضی جیسی ہستیوں سے ہوتا ہوا قمر جمالی تک آپہنچا۔ تقسیم ہند کے بعد بہت سے لوگ رہ گئے اور بہت

سے پاکستان چلے آئے یہاں میری نظر ہے استاد عاقل امروہوی سے لے کر قمر جمالی تک بڑے استاد بڑے شاعر شاعری پر پوری گرفت رکھنے والے میری نظر سے گزرے ان سب کو قریب سے دیکھا اور سنا ان کے ساتھ مشاعرے پڑھے ان کی رفاقت سے لطف اندوز ہوا مثلاً شعیب حزیں، نعیم فاروقی جن کا جوانی میں انتقال ہو گیا جو میرے بہت قریبی دوست بھی تھے اور شعیب حزیں صاحب کے برادر نسبتی بھی۔ نظر امروہوی، ہوش امروہوی، ساقی امروہوی، قیصر امروہوی، قمر جمالی تک۔ میں نے ان کو اپنا بہترین دوست پایا اور اپنے دکھ درد کا ساتھی۔ قمر جمالی کی عمر کا بہترین حصہ سیاست کی نظر ہو گیا میری نظر میں وہ پاکستان کی چلتی پھرتی اور بولتی تاریخ ہیں۔ یہاں آنے کے بعد انہوں نے وہ سب دکھ جھیلے جو ایسے مخلص آدمی کو جھیلنے پڑتے ہیں اگر وہ چاہتے تو دولت کا انبار لگا سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور رزقِ حلال پر ہی اکتفا کیا۔ آج بھی وہ کسی دوست کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں۔ زندگی کے ایک موڑ پر شریکِ حیات کی جدائی کا المیہ جس کو سوائے ان کے کوئی دوسرا محسوس بھی نہیں کرسکتا پھر بچوں کا مستقبل ان کی تعلیم و تربیت کا تنہا بوجھ یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں مگر قمر جمالی نے ان سب حالات کا جواں مردی سے تنہا مقابلہ کیا اور خدا کا شکر ہے کہ وہ اپنے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ ان حالات میں بھی شاعری کرتے رہے، ویسے میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ایسے وقت میں شاعری بڑا سہارا دیتی ہے۔ کیونکہ خوددار آدمی جو بات کسی سے نہیں کہہ سکتا وہ بڑی خوبصورتی سے شعر میں کہہ جاتا ہے جس سے اس کی انا کو تسکین ملتی ہے۔ قمر جمالی شاعری کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہیں کیونکہ بچپن سے آنکھ انہوں نے اسی ماحول میں کھولی اور شاعری کو ہمیشہ ثانوی حیثیت دی کبھی شاعری کے پیچھے نہیں دوڑے یہی وجہ ہے کہ ان کا مجموعہ نصف صدی طے کر کے آیا۔ شعر میں جان کر کوٹ نہیں کر رہا ہوں کیونکہ ان کا مجموعہ آپ کے سامنے ہے آپ خود پڑھ کر اندازہ لگائیں ان کا تقابل بھی کسی شاعر سے کرنا نہیں چاہتا کیونکہ وہ شاعری میں کسی کے مقلد نہیں ہیں اور نہ ہی کسی کی پیروی کرتے ہیں اپنی بات اپنے اسلوب، اپنے لہجے میں کہتے ہیں ان کی شاعری ذاتی اور ہنگامی حالات حوادث کی طرف ردِ عمل کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ زندہ آدمی اور آفاقی مسائل کے حقائق ان کے غور و فکر کو پیش کرتی ہے قمر جمالی نے

روایت سے رشتہ نہیں توڑا ہے اور جدیدیت سے انحراف بھی نہیں کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں لمحۂ موجود کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں ۔ ان کی شاعری میں سنگ لاخ زمینوں کا استعمال نہیں ہوا ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ اچھی شاعری کے لئے شگفتہ زمینوں کا ہونا ضروری ہے ۔

سنگ لاخ زمینوں سے ذہنی ورزش تو ہو جاتی ہے اچھی شاعری نہیں ان کے نزدیک اچھی شاعری شاعر کی نفسیاتی اور جذباتی گہرائیوں سے نکلتی ہے ان کے نزدیک ہر زمین میں غزل کہہ کر دکھانا استادانہ کرتب تو ہو سکتا ہے شاعرانہ کمال ہرگز نہیں ۔ قمر جمالی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری کا رعب بھی کسی پر نہیں ڈالتے ہر شخص سے انتہائی خلوص اور صاف دل سے ملتے ہیں ۔ وہ دوستوں کے تو دوست ہیں مگر منافقوں کو بھی مایوس نہیں کرتے ۔ میرے خیال سے یہ ہنر عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے یہ تو بڑے صاحب ظرف کا حصہ ہوتا ہے ۔ قمر جمالی حیات اور کائنات کے بارے میں مستقل ذاتی دوٹوک نظریہ رکھتے ہیں تاہم ان کے حوصلہ کی داد دینی پڑتی ہے کہ اس طرز احساس کے ہوتے ہوئے وہ جینے کی امنگ اور کام کرنے کی لگن کو برقرار رکھے ہوئے ہیں جبکہ زندگی میں حوادث کا بھی دخل رہا ہے اور قمر جمالی کے دل و دماغ کو دوچار ہونا پڑا ہے ۔

قمر جمالی کے کلام میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو آج کے دور کے تقاضوں پر پوری اترتی ہیں ان کے مجموعے میں چونکا دینے والے اور دل میں اتر جانے والے اشعار کی تعداد خاصی ہے ان کی شاعری میں سادگی و پرکاری ، دردمندی اور برجستگی ، حوصلہ مندی ان کے کلام میں جذبہ ، تفکر دل آویزی کے ساتھ باہم شیر و شکر نظر آتے ہیں اور زندگی پر عمیق نگاہ کے نتیجے میں حاصل ہونے والے فراواں تجربات تخلیق کی آنچ میں ڈھل گئے ہیں جو صرف خوبصورت ہی نہیں فکر انگیز اور بصیرت افروز بھی ہیں میری نظر میں قمر جمالی ایک شاعر کا نام ہی نہیں ایک عہد کا نام ہے ۔

پروفیسر شبنم صدیقی

شبستانِ مصحفی کا جدید شاعر

کچھ دنوں سے ایک شعر میرے ذہن کی فضاؤں میں گونج رہا ہے اور اس تواتر سے میرے لبوں پر جاری ہے جیسے میرے سانس کی آمد و شد کا ایک حصہ بن گیا ہو۔ وہ شعر ہے۔

ہم نہ ہوتے تو اے غمِ دوراں
کون کرتا تری پذیرائی

آپ نے کچھ غور فرمایا کہ اس شعر کی اثر انگیزی کا راز کیا ہے؟ تو سنئے کہ یہ شعر ہمارے شعری وجدان کے کینوس پر ایک انمٹ نقش بن کر اس لئے ثبت ہو گیا ہے کہ یہ اس وقیع دبستان کے شعری مزاج کی بھرپور ترجمانی کر رہا ہے۔ جس کو "دبستانِ مصحفی" کہتے ہیں اور جس کے قابلِ قدر وابستگاں میں ایک جناب قمر جمالی امروہوی ہیں جن کا تازہ مطبوعہ مجموعۂ کلام "صحرا میں شجر" آج کل میرے زیرِ مطالعہ ہے۔ یہ خوبصورت اور پر اثر شعر اسی مجموعۂ کلام کی دین ہے۔

اور ایک یہ شعر کیا قمر جمالی صاحب کا پورا کلام اسی شعری دبستان کا ایک خوبصورت عکس ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ قمر جمالی صاحب "دبستانِ مصحفی" کے شاعر اس

لئے نہیں ہیں کہ وہ امروہہ میں پیدا ہوئے بلکہ اس لئے کہ انہوں نے دبستانِ مصحفی کے شعری مزاج کی روح کو اپنے کلام میں سمولیا ہے۔

تو آیئے دیکھتے ہیں کہ دبستانِ مصحفی کا شعری مزاج ہے کیا؟ اور اس کی دلکشی کا راز کیا ہے؟

آنجہانی فراق گورکھپوری نے اپنے منفرد تنقیدی مضامین کے مجموعے "اندازے" کے ایک شاہکار باب میں مصحفی کے کلام کے بارے میں کچھ اس طرح کے الفاظ رقم کئے تھے "فراق کی کتاب اس وقت میرے سامنے نہیں" کہ اگر میر کے یہاں آفتاب نصف النہار کی جاں سوز تمازت ہے تو سودا کے یہاں اس کی عالمگیر روشنی میں جو ایک "خوشگوار اعتدال" پیدا ہو جاتا ہے وہ مصحفی کے کلام کی خصوصیت ہے۔

فراق گورکھپوری کے اس بیش قیمت تجزیے کو پروفیسر کلیم الدین احمد جیسے "سخت گیر" نقاد نے فراق کی تنقید کا ایک شاہکار قرار دیا تھا اور انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان الفاظ میں فراق نے مصحفی کے کلام کی انفرادیت کو پیش کر دیا ہے۔ اور بات کلیم الدین احمد کے خراجِ تحسین کی نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ فراق سے پہلے کسی نے مصحفی کو ایک منفرد شعری مزاج رکھنے والے دبستان ساز شاعر کی حیثیت سے پیش ہی نہیں کیا تھا۔

قمر جمالی صاحب کے کلام میں جذبے کی حرارت ہے مگر اس کی شدت میں اعتدال ہے۔ ان کے کلام میں خیال کی روشنی بھی ہے مگر اس کی جگمگاہٹ میں بھی اعتدال ہے۔ یہ اعتدالِ فکر واحساس کوئی شاعرانہ خامی نہیں ہے۔ یہ تو شاعری میں متانت، وقار اور رکھ رکھاؤ موجود ہے۔

متوجہ کر لینے والی زمینیں، بولتے ہوئے مطلعے، برجستہ مصرعے، رواں دواں اشعار، الفاظ وتراکیب کا خوبصورت صوتی دروبست اور اس سے پیدا ہونے والی خوشگوار غنائیت، صاف ستھری غزلیں سلجھا ہوا شفاف اندازِ بیان، چند معمولی خامیوں سے قطع نظر اسلوبِ اظہار پر استادانہ گرفت، اور مذکورہ بالا متانت، وقار، رکھ رکھاؤ اور اعتدالِ فکر و احساس یہ تمام چیزیں دبستانِ مصحفی کی یاد دلاتی ہیں اور ان کے کلام میں ایک تہذیبی جہت پیدا کرتی ہیں۔ مثالوں کی گنجائش نہیں۔ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے آپ خود ملاحظہ فرما

سکتے ہیں مگر ایک بہت خوبصورت اور پر اثر غزل کے اشعار پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیجیے دیکھیے۔

مدتوں خوشبوئے یار آئی بہت
جس نے میری روح مہکائی بہت
کس کی بربادی کا آخر جشن ہے
بج رہی آج شہنائی بہت
ہم نے اس کو بھی بجھا کر رکھ دیا
جس دیئے سے روشنی پائی بہت
ہم سا دیوانہ نہ ہو گا کوئی بھی
یوں تو ہونگے تیرے شیدائی بہت
کوئی تو ہوتا شب غم کا علاج
کھل رہی ہے اب تو تنہائی بہت
پیش خیمہ ہے کسی طوفان کا
لو دیئے کی آج تھرائی بہت
زندگی کا ساتھ دے کر اے قمر
ہم نے جینے کی سزا پائی بہت

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ''دبستانِ مصحفی'' کا ترجمان شاعر قرار دے کر میں نے قمر جمالی صاحب کو عام مقلد شاعر کا درجہ دے دیا ہے۔ جی نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ دبستانِ مصحفی کی خصوصیات قمر جمالی صاحب کے کلام میں ایک ''تہذیبی جہت'' پیدا کرتی ہیں۔

شاعری اور ادب خود بھی ''کلچر'' کا ایک حصہ ہوتا ہے اور کسی نہ کسی ''کلچر'' کا عکاس اور ترجمان بھی ہوتا ہے اور ''کلچر'' کی نوعیت انفرادی نہیں ہوتی۔ دنیا کے بڑے بڑے منفرد شعرا کسی نہ کسی کلچر کے سیاق وسباق میں اپنا انفرادی فن پیش کرتے ہیں وہ جس شعری وادبی کلچر کی ترجمانی کرتے ہیں وہ انفرادی نہیں ہوتا مگر ان

کا فن انفرادی ہوتا ہے۔ اور جس "کرب" سے ان کے فن کی تخلیق ہوتی ہے اس کی نوعیت ذاتی اور انفرادی ہوتی ہے اور اگر ان کے فن کا محرک کوئی اجتماعی کرب بھی ہوتا ہے تو آج تک وہ ان کی ذات کے سانچے میں ڈھل کر انفرادی رنگ روپ اختیار نہیں کر لیتا تخلیقِ فن کا سرچشمہ نہیں بن سکتا۔

قمر جمالی صاحب کی شاعری بھی دبستانِ مصحفی کے تہذیبی آب و رنگ سے آراستہ ہو کر ان کے اپنے کرب کی ترجمانی کرتی ہے اور ان کی روح کی پکار بن جاتی ہے۔

یہ کرب دو سطحوں پر نظر آتا ہے۔ ایک خالصتاً ان کا ذاتی کرب ہے جس کا تعلق ان کی زندگی کے ایک المناک واقعے سے ہے جس نے ۱۹۷۸ء میں ان کی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا کر دیا۔ اس المیے کی نوعیت "ذاتی" بھی ہے "انسانی" بھی اور "آفاقی" بھی۔ اس کی ترجمانی کے حوالے سے چند اشعار پر نظر ٹھہر جاتی ہے۔

دھوپ مجھ تک نہ آئی میں جب تک
اس کی زلفوں کے سائبان میں تھا
جانے وہ پیڑ کس نے کاٹ دیا
کل تلک جو مرے مکان میں تھا

❖❖

میں پھل دار پیڑ تھا کل تک
بے ثمر کر دیا گیا ہے مجھے

❖❖

گیا ہے اے قمر جس دن سے وہ رشکِ قمر اٹھ کر
بہت تاریک سی بزمِ قمر معلوم ہوتی ہے

دوسرا کرب اجتماعی نوعیت کا ہے جسے شاعر نے اپنی ذات کا حصہ بنا کر اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ یہ کرب قمر جمالی کے یہاں دو حوالوں سے آیا ہے عام معاشرتی حوالے سے بھی اور وطنِ عزیز کے ایک مخصوص طبقے کے حوالے سے بھی جس کی نشان دہی کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اہلِ نظر خود سمجھ سکتے ہیں

مخصوص طبقاتی حوالے سے جس کرب کی عکاسی کی گئی ہے اسے سمجھنے کے لئے درج ذیل اشعار پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔

ایک ہجرت نے تو صدیوں کا سفر روک دیا
دیس سے اب کے بھی کیا دیس نکالا ہو گا

❖❖❖

چمن پر کیا ہمارا حق نہیں ہے اے چمن والو
جلائیں جائیں گے آخر ہمارے آشیاں کب تک

❖❖❖

جان دے دیں گے اس چمن کے لئے
ہم نشیمن جلا کے آئے ہیں

❖❖❖

اس سے بہتر تھا اندھیروں میں بسر کر لیتے
رات کے بعد جو انجامِ سحر دیکھا ہے
مجھ کو معلوم نہیں کون سا گھر ہے میرا
لوگ کہتے ہیں ہم نے ترا گھر دیکھا ہے

❖❖❖

رخ ہواؤں کا جو بدلا ہوا دیکھا ہم نے
آشیاں چھوڑ دیا برق و شرر سے پہلے

❖❖❖

شہر مقتل بنا ہوا ہے مگر
ہر طرف بج رہی ہے شہنائی

❖❖❖

ایک ہی شمعِ وفا کا یہ کرشمہ دیکھئے
ان کی محفل میں اجالا اور میری محفل میں آگ

ہمیں بہار کا پروردگار کہتے ہیں
نکل گئے جو گلستاں سے ہم تو کیا ہوگا

گھر سے منزل پہ پہنچنے کے لئے نکلے ہیں
طول کھینچے گا کہاں تک یہ سفر دیکھیں گے

شام کو جب کوئی طائر لوٹ کے گھر جائے ہے
مجھ کو بھی اس وقت اپنا آشیاں یاد آئے ہے

وہاں سب میرے اپنے تھے کبھی گھر تھا جہاں میرا
نہ اب وہ شہر ہے میرا نہ اب وہ آشیاں میرا

نہ جانے زندگی کا یہ سفر کتنا کٹھن گزرے
نہ اہلِ کارواں میرے نہ میر کارواں میرا

سر چھپانے کوئی کہاں جائے
دھوپ جب سائبان سے گزرے

گھر کیسے پرندوں کی طرح لوٹ کے جائے
جس کو نہ میسر ہو کہیں کوئی ٹھکانا

یہ چمن تو خزاں رسیدہ تھا
ہم نے آسودۂ بہار کیا

بے دیاری ہے اور ہم ہیں قمر
جب سے قسمت نے بے دیار کیا

کیسا یہ گھر دیا گیا ہے مجھے
در بدر کر دیا گیا ہے مجھے

کام لیتے تھے جو قلم سے کبھی
ان کے ہاتھوں میں آج خنجر ہے

چمن اجڑنے کا شکوہ کریں تو کس سے کریں
کیا ہی کیوں تھا بھروسہ چمن کے مالی پر
قمر ہم اس کے لئے اپنی جان دے دیں گے
جو آنچ آئی کبھی پرچم ہلالی پر

تم روز مجھے دیتے ہو الزامِ بغاوت
یہ بھی کبھی سوچا مرے منہ میں بھی زباں ہے
جائیں تو کدھر جائیں کہ مسدود ہیں راہیں
اب سامنے منزل ہے نہ منزل کا نشاں ہے

تعصب کو ہوا دو گے تو یارو
دلوں میں اور بھی کینہ پڑے گا

پھول اپنے نہ باغ اپنا ہے
کیوں کوئی شکوۂ بہار کرے

جانے میرے شہر کو کس کی نظر نے کھا لیا
رقص کرتی تھی یہاں ہر ہر نفس میں زندگی

لہو کتنا ہوا ہے صرف ان کا کون پوچھے گا
مکاں تو ہو گیا تعمیر معماروں پہ کیا گزری

اس کو مسمار کس طرح کر دوں
گھر بنایا ہے میں نے گھر کی طرح
کیسے کہہ دوں کہ رات بیت گئی
جب سحر ہی نہیں سحر کی طرح

نفرت کی آندھیوں کا ابھی زور کم نہیں
تیور بتا رہے ہیں یہ گرد و غبار کے

اور ذرا دیکھئے کتنی عجیب و غریب ہے یہ اجتماعی نفسیات جس کی جھلک ابھی آپ نے دیکھی۔ کبھی تو سٹلجیا، کبھی پچھتاوا، کبھی جذبۂ وفاداری، کبھی عزمِ جاں نثاری، کبھی احساسِ فریب خوردگی، کبھی مایوسی اور ناامیدی، کبھی بے گھری کا احساس، کبھی شناخت کے گم ہو جانے کا غم، کبھی ماضی کے بند دروازوں کا منظر، کبھی مستقبل کی بند گلی کے ڈرامے، وغیرہ وغیرہ۔

بقول اختر انصاری دہلوی ؎

مٹ چکیں ساری امیدیں اختر
آرزو ہے کہ جئے جاتی ہے

اور اگر شاعر کے اجتماعی کرب کو عام معاشرتی حوالے سے دیکھیں تو قمر جمالی کے اشعار میں وہ تمام تضادات، وہ تمام سنگین اور عبرت انگیز حقائق، وہ تمام سفاکیاں اور المناکیاں جھانکتی ہوئی نظر آئیں گی جو نئے معاشرے کے ہر طبقے کے لئے جدید دور کے

تحفے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

میں نے اس مقالے کا عنوان ''شبستانِ مصحفی کا شاعر'' نہیں ''شبستانِ مصحفی کا جدید شاعر'' رکھا تھا جدید شاعر وہ ہوتا ہے جس کے کلام میں ''روح عصر'' ہو۔ قمر جمالی کے ''روح عصر'' سے بھر پور اشعار پیش کر کے پھولوں کی جس چھڑی سے میں نے ابھی آپ کو پیٹا ہے اس کی مار کھا کر آپ ہاتھ جوڑ کر کہہ رہے ہوں گے کہ صاحب قبول کیا ہم نے کہ قمر جمالی صاحب ''جدید'' شاعر ہیں۔

اب رہ گئی بات ''شبستان'' کی تو خدا لگتی کہیے گا کہ کیا ''دبستانِ مصحفی'' کا شعری مزاج ''شبنمیں'' نہیں ہے؟ تو اگر شبنم صدیقی نے ''دبستانِ مصحفی'' کو ''شبستانِ مصحفی'' اور قمر جمالی کو ''شبستان مصحفی کا جدید شاعر'' قرار دے دیا تو کیا برا کیا؟

اور اب آخر میں ایک بات اور۔ مصحفی اور قمر جمالی میں ایک مماثلث اور ہے۔ مصحفی نے باوجود اس کے کہ اپنے زمانے ہی میں اپنے ''شاعرانہ وجود'' کا لوہا منوالیا تھا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جتنے شاگردان کو نصیب ہوئے اتنے شاید ہی کسی اور شاعر کو نصیب ہوئے ہوں۔ مگر ان کے کلام کے اصل جوہر کو فراق گورکھپوری سے پہلے پہچانا نہیں گیا تھا۔ بڑے بڑے لوگ صرف اتنا کہہ کر رہ جاتے تھے کہ مصحفی کے کلام میں ہر طرح کے اشعار موجود ہیں اور ان کا کوئی خاص رنگ نہیں۔ یہ فراق گورکھپوری تھے جنھوں نے سب سے پہلے ان کی انفرادیت کو پہچانا اور ان کی شاعری کے ساتھ انصاف کیا اور فراق کی ناقدانہ عدالت کے اس فیصلے کو بڑے بڑے تندمزاج منصفوں نے تسلیم کیا۔

قمر جمالی صاحب کی شاعری کے ساتھ بھی ابھی تک انصاف نہیں ہوا ہے اور میں اس بات کا شاہد ہوں کہ شہر کے چھوٹے چھوٹے مشاعروں تک میں تقدیم وتاخیر کے حوالے سے ان کو ان کا صحیح مقام نہیں دیا جاتا۔ اس کے باوجود اکثر مشاعروں میں دیکھا گیا ہے کہ قمر جمالی نے اپنے پر اثر اشعار سے سامعین کو بے حد متاثر کیا اور داد وتحسین حاصل کی ان کے اشعار میں پختگی اور فن کا اعلیٰ معیار پایا جاتا ہے بقول ان کے پہلے یا بعد میں پڑھنا کوئی معنے نہیں رکھتا مقام کا تعین شعر ہوتا ہے اس لئے ان کو اس بات کی پرواہ نہیں کہ پہلے پڑھوایا جاتا ہے یا بعد میں۔

میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ ان کی شاعری کے ساتھ انصاف کریں، ان کے شاعرانہ مرتبے کو پہچانیں اور بہت بڑی تعداد میں ان کے شاگرد بن کر مصحفی کے شاگردوں کی یاد کو تازہ کر دیں۔ اور ان کے انقلابی پیغام پر عمل کرتے ہوئے "نظام شہر یاری" بدل ڈالیں۔

☆☆☆

maablib.org

شارق بلیاوی

صحرا میں شجر...... کا شاعر قمر جمالی

دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں میں ایک قابلِ ذکر دبستان مصحفی کا بھی ہے۔ مصحفی اپنے وقت کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے زبان وبیان کی تراش خراش میں یہ دبستان یعنی مصحفی ایک نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔

قمر جمالی امروہوی کا تعلق بھی دبستانِ مصحفی ہی سے ہے۔ کسی دبستان پہ کسی استاد سے شعری تعلق ظاہر کرنا تو آسان ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ شاعر پر اس استاد یا دبستان کے اثراتِ علمی کہاں تک واضح ہیں۔ ''صحرا میں شجر'' کا مطالع میں نے اسی تناظر میں کیا۔ اور یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ قمر جمالی امروہوی کے یہاں اس دبستان کا پرتو ہے اور زبان و بیان کے معاملے میں جمالی صاحب نے کافی حد تک اپنے اشعار کو فنی اوصاف کا متحمل رکھا ہے۔ شائستگیِ بیان اور سلاستِ زبان کا بھرم رکھا ہے قمر جمالی کہنہ مشق اور صاحبِ طرز شاعر ہیں ان کے یہاں سادگی اور پرکاری کا فقدان نہیں اشعار میں غرابت یا بے جا تصرفاتِ لفظی سے اجتناب برتا ہے۔ عام فہم زبان میں اشعار کہنا کافی مشکل ہوتا ہے شاعر کا کمال یہی ہوتا ہے کہ اپنی فکریات آسان اور سہل تر الفاظ میں بیان کرے ابلاغ اہم عنصر ہوتا ہے اگر شعر میں ابلاغ کا فقدان ہو تو شعر اپنی وجودی حیثیت میں ایک طرح سے مہمل ہو جاتا ہے۔ قاری تک اپنے خیالات کی ترسیل کے ڈھیر سارے ذرائع ہیں۔ تاہم دوسری اصناف کی بہ

نسبت شاعری بالخصوص غزل اپنے اندر زیادہ ہمہ گیریت اور تاثیر رکھتی ہے ۔ غزل کے اشعار غنائی اعتبار رکھتے ہیں اور چونکہ بحور جتنی ہیں سب کی سب موسیقیت کو مد نظر رکھ کر ہی ترتیب دی گئی ہیں لہٰذا غزل کے اشعار مترنم اور غنائیت سے بھر پور ہوتے ہیں قمر جمالی کے یہاں رواں مصرعے نظم ہوئے ہیں ۔ مصارع کی روانی سے اشعار میں خود بہ خود موسیقیت اُبھر آتی ہے جو قاری کے ذہن و دل کو متاثر کئے بغیر نہیں چھوڑتی ۔ قمر جمالی نے تقریباً تمام شعری موضوعات کو قلم بند کیا ہے ۔ ان کے حیطۂ فکر میں ہر شعر اپنی جمالیاتی رچاؤ کے ساتھ حیساتی اظہاریہ بھی رکھتا ہے ۔ یہ ساری باتیں اسی وقت پیدا ہوسکتی ہیں جب ایک شاعر برسوں کی مشق سے کچھ حاصل کر پاتا ہے ۔ ایک فکریہ شعر دیکھئے:

میں اپنی زندگی سے پوچھتا ہوں
فسانے کا مرے عنوان کیا ہے

یہاں زیست سے فسانے کا عنوان پوچھنا، قاری کی سوچ کو مہمیز کرتا ہے کہ زندگی کے بارے میں سوچے ۔ زندگی کیا ہے یعنی ہم جس انداز میں گزر بسر کر رہے ہیں اس کا مفہوم کیا ہے ۔ انسان زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتا رہتا ہے کوئی ایک منزل متعین نہیں مختلف سانحات، واقعات سے بھر پور زندگی انسان کی سوچ کو متاثر کرتی ہے اور سمجھ نہیں پاتا کہ ان تمام حالات کو کیا نام دیا جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ ایک جگہ فرماتے ہیں ۔

خدمتِ دار و رسن کرتے رہیں گے ہم بھی
جب تک اس شہر میں تذلیل بشر دیکھیں گے

انسان کی تذلیل پوری انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے لہٰذا شاعر یہاں اپنی حیساتی رجحان کا اظہار کر رہا ہے ۔ جور و ظلم یا انسانیت کی بے حرمتی کسی حساس انسان کو گوارا ہی نہیں ہوتی اور شاعر تو بلا کا حساس ہوتا ہے ۔ لہٰذا قمر جمالی نے یہی بات کہی ہے کہ میں ظلم و جور کی واردات یا انسانی دشمن محرکات کے خلاف پڑی تو اپنی زندگی کی بازی بھی لگا دونگا ۔ پھر ایک جگہ فرماتے ہیں ۔

ہم نہ ہوتے تو اے غمِ دوراں
کون کرتا تری پذیرائی

یہاں شاعر غم دوراں یعنی انسان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھ سینے سے لگا رکھا ہے یہی اس کی پذیرائی ہے۔ اور یہی انسان دوستی کی علامت اور اس بات کو ایک اور انداز میں بیان کرتے ہیں۔

بارِ غم کیسے اُٹھا پائے گا تنہا انساں
کیا ہمارے بعد بھی آئے گا ایسا آدمی

تشویش کی بات ہے شاعر فکر مند ہے کہ ہمارے بعد کون غموں کا بوجھ اُٹھائے گا۔ ہر انسان دکھوں سے پریشانیوں سے کما حقہٗ نبرد آزما ہونے کی صلاحیت تو رکھتا نہیں۔ شاعر یعنی قمر جمالی کا یہ خوف کہ جب میں نہیں ہوں گا تو انسان تنہا ہو جائے گا پھر غم دوراں سے کیسے لڑے گا، شاعر کا یہ حق خیال ہے یہاں تشویش کی شکل ہی ایک تعمیری سوچ پیدا کی گئی ہے کہ انسان اکیلا دکھوں یا حالات سے مقابلہ نہیں کر سکتا اسے انسانی سہارے اور تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر فرماتے ہیں۔

آدمی مظلوم بھی ہے آدمی ظالم بھی ہے
آدمی کو آدمی ہو کر نہ سمجھا آدمی

اس شعر میں تکرار لفظی یعنی آدمی کی تکرار ایک حسن شعری پیدا کر رہا ہے زبان و بیان کی چاشنی سے اس کا لطف دوبالا ہو گیا ہے۔ واقعی آدمی پر ظلم آدمی ہی تو کرتا ہے۔ جانور نہیں کرتے اور یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ آدمی کیوں نہیں سمجھتا۔ آج ہم طاقتور ہیں کل دوسرا ہم سے زیادہ طاقت ور نکل سکتا ہے پھر کیا ہوگا؟ یہی سمجھایا جا رہا ہے کہ آدمی آدمی کو آدمی سمجھے وہ خود بھی آدمی ہے تو ہم جنس کے ساتھ اس قدر ظلم و جبر کیوں کر روا ہو سکتا ہے۔ ایک اور فکری شعر ملاحظہ فرمائیں۔

وقت اپنی رفعتوں پر آپ شرماتا رہا
فکرِ مستقبل تھی ماضی سامنے آتا رہا

یہ شعر انسان کی اپنی حسیات کا مظہر ہے۔ وقت چاہے جتنا آگے نکل جائے ماضی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ گزرے لمحات لمحۂ موجود کو ہمیشہ تازیانے لگاتے رہتے ہیں۔ ماضی چاہے خوشگوار گزرا ہو یا ناگوار ذہنِ انسان اس کی حرارت ہمیشہ محسوس کرتا رہتا ہے وہ اس

لئے کہ انسان کا ذہن جب ایک بار کسی المیہ یا طربیہ سے متاثر ہو جاتا ہے تو اُس کا عکس محفوظ کر لیتا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً وہی عکس سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ اس طرح آنے والا وقت موجودہ وقت ماضی کی اثر انگیزی سے یکسر مبرا نہیں ہو سکتا۔ یہی زندگی کا اصول اور عملی احوال ہے۔ ایک اور شعر پر غور کریں:

کون کیسا ہے یہ میں نے آج تک سوچا نہیں
خود ہی اپنے آپ کو آئینہ دکھلاتا رہا

اس شعر کے ذریعے شاعر ایک عمدہ درس دے رہا ہے تجربہ بیان کر رہا ہے جو زندگی کے لئے کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ انسان کی عام فطرت ہے کہ دوسرے کے بارے میں سوچتا رہتا ہے کون کیسا ہے کیا ہے۔ ایسا ہے ویسا ہے مگر اپنے گریبان میں جھانک کر نہیں دیکھتا کہ خود کیسا ہے۔ انسان پہلے اپنی خامیوں اور عیب پر نظر ڈالے پھر کسی دوسری طرف سوچے جب اپنے عیوب یا ناقص العقلی نظر آئے گی پھر دوسرے کی عیب جوئی نہیں کرے گا۔ یہ اخلاقیات کا ایک اہم درس ہے جسے ہر انسان کو اپنانا چاہیے۔ ایک اور شعر دیکھئے ۔

گلستاں کی ہر اک شئے دعوتِ نظارہ دیتی ہے
کے فرصت ہے اب ظرفِ نظر کو آزمانے کی

یہ عالم یونہی نہیں بنا۔ بنانے والے نے اس کے اندر بہت ساری نشانیاں رکھ چھوڑی ہیں جس کو دیکھ کر آدمی اپنے وجود کی اہمیت کا اندازہ کر سکتا ہے ان نظاروں میں حسن بھی ہوتا ہے قبح بھی ہوتا ہے۔ نظر فریبی بھی ہوتی ہے نصیحت بھی، یعنی یہ بنتے بگڑتے مناظر انسان کے اپنے وجود کی اصل غرض وغائت کے علاوہ ارضی اور طبعی حقیقت کا درس دیتے ہیں ، آدمی اگر سمجھے تو، اور شعر دیکھئے ۔

یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے
تری چشمِ عنایت چاہتا ہوں

اس شعر میں انا پرست محبوب کی طرف اشارہ ہے۔ عاشق ہمیشہ اپنے محبوب سے نظرِ التفات کی توقع رکھتا ہے۔ مگر شاعر اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے اور سمجھا رہا ہے کہ محبوب سے لو تو لگاؤ مگر کسی چشمِ عنایت کی امید نہ رکھو کیونکہ یہ مشکل امر ہے۔ ایک اور شعر

ملاحظہ فرمایئے۔

زہر پی لیتا ہے سچا آدمی
اور سچائی کا کیا معیار ہے

سقراط بڑا فلسفی تھا سچ کی پاداش میں اسے زہر پلا کر ہلاک کر دیا گیا شاعر نے یہاں تلمیح سے کام لے کر یہ بات یاد دلائی ہے کہ سچائی میں رسوائی اور نقصان ممکن ہے۔ یہاں طنز بھی ہے کہ کیا یہی سچائی کا معیار ہے؟ بہر کیف قمر جمالی کی شاعری تمام فکری جہات کو سموئے ہوئے ہے، اشعار میں روانی اور معنی آفرینی کے علاوہ شگفتگی بھی خاصی ہے ان کی یہ کتاب میں نے پڑھی ہے اور یہ اندازہ لگایا ہے کہ قمر جمالی ایک حساس متحرک دل کے علاوہ عالمی سوچ کے مالک ہیں۔ سماجی فعالیت ان کے یہاں موجود ہے۔ انسان دوست اور نرم مزاج آدمی ہیں یہ ذاتی طور پر نہیں بلکہ ان کے اشعار پڑھ کر تجزیہ کیا ہے اس لئے کہ انسان کیا ہے وہ منہ سے بولتا نہیں ہے تو بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ ایک شاعر تو اپنے خیالات اور اشعار کی روشنی میں بالکل آشکار ہوتا ہے اشعار جبلی اور شعور کے امتزاج سے ہی جنم لیتے ہیں۔ اور اس طرح قمر جمالی مع اپنے خدوخال کے ہمارے سامنے ''صحرا میں شجر'' بن کر کھڑے ہیں۔

☆☆☆

نسیم انجم

"صحرا میں شجر" ایک مطالعہ

اہلِ فارس نے کیا خوب کیا ہے کہ " شاعری جزویست از پیغمبری" یقیناً ان مفکروں کی کہی گئی یہ نکتہ آمیز بات اُن شعراء کے لئے درست ہے جو اپنی شاعری کے ذریعے اصلاحِ معاشرہ کا کام کرتے ہیں، حق کا پرچار اور باطل کی نفی کو اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا درس دیتے ہیں اور حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد پر عمل کرتے نظر آتے ہیں لیکن اس کے برعکس شعراء کا وہ کلام جو منفی خیالات پیدا کرلے، غیر اخلاقی باتوں کو پروان چڑھانے، اور جس کو پڑھتے اور سنتے ہوئے پراگندہ سوچ اور خیالات جنم لیں، ذہن تاریک ہو۔ راہِ راست سے بھٹکنے کا خطرہ لاحق ہو تو اس قسم کی شاعری اس مقولے سے خارج ہے۔

ان حقائق کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو قمر جمالی کی شاعری مذکورہ مقولے پر پوری اترتی ہے۔ ان کی شاعری کی مدت نصف صدی سے زیادہ عرصے پر محیط ہے، ان کی غزلیں عصری شعور، روایت کی پاسداری اور پاکیزہ خیالات سے مزین ہیں۔

قمر جمالی کا اصل نام مثال احمد خاں، تخلص قمر اور کنیت جمالی ہے۔ تاریخ پیدائش ۳ رجنوری ۱۹۲۵ء ہے۔ قمر جمالی کا نام اور تخلص دونوں ہی ان کی ذات پر اثر انداز ہوئے ہیں، وہ اپنی شاعری، سماجی و معاشرتی حوالوں سے اپنے طبقۂ فکر کے لوگوں میں مہتاب بن

کر اُبھرے ہیں، اس بات کا انہیں خود بھی احساس ہے، اپنے اس جذبے اور محسوسات کو انہوں نے شاعری کے قالب میں اس طرح ڈھالا ہے۔

میں مثلِ قمر ہوں یہی پہچان ہے میری
اب تک یہ زمانہ مجھے پہچانا نہیں ہے

قمر جمالی پر بہت سے غموں اور پریشانیوں نے بیک وقت حملہ کیا، لیکن انہوں نے نہایت حوصلے اور ہمت کے ساتھ پیش آنے والی مشکلات کا مقابلہ کیا، اپنی اہلیہ کی وفات کے بعد اہلیہ کی ذمے داریاں بھی احسن طریقے سے نبھائیں اور ماتھے پر شکن بھی نمودار نہیں ہوئی، بن ماں کے گیارہ بچوں کی پرورش کرنا آسان کام نہیں تھا، بلکہ مشکل ترین اور صبر آزما مرحلہ تھا، جسے انہوں نے بہ خوبی اس طرح انجام دیا کہ ان کی تعلیم وتربیت میں کسی قسم کی کمی نہ ہونے دی، بحیثیت باپ بچوں پر اس قدر محبت اور توجہ دی کہ ان میں احساسِ کمتری پیدا نہ ہو سکا، اپنے انہی کاموں کی بدولت قمر جمالی ان لوگوں کے لیے مثال بن گئے جو کم ہمت واقع ہوئے ہیں اور معمولی باتوں پر ہمت وحوصلہ ہار بیٹھتے ہیں۔

قمر جمالی کی شاعری ان کے تجربات کا نچوڑ ہے، ان کے ماضی وحال کی روداد ہے، قمر جمالی نے ہجرت کے عذاب کو سہا ہے نقلِ وطن کے دوران آنے والی مشکلات اور مصائب کو برداشت کیا ہے، لیکن ان دکھوں کو جھیلنے کے باوجود اپنے دیس میں سکون اور خوشی میسر نہ آسکی۔ وہی عداوتیں، تعصب، اقربا پروری، قتل وغارت، کہ رہنے بسنے کے لیے زمین تنگ ہوگئی، اس قسم کے حالات نے انہیں یہ کہنے پر مجبور کردیا کہ۔

ایک ہجرت نے تو صدیوں کا سفر روک دیا
دیس سے اب کے بھی کیا دیس نکالا ہوگا

پاکستان اسی لیے وجود میں آیا تھا کہ سب لوگ مل جل کر مکمل آزادی واطمینان کے ساتھ زیست بسر کریں گے، کوئی روک ٹوک اور مذہبی منافرت نہ ہوگی اسی سوچ کے تحت لوگوں نے تن من دھن کی قربانیاں دیں، لیکن آج کے جو حالات ہیں، اس نے سب کو ہی بے حد مایوس کیا ہے۔ اس لیے کہ مسلمان آپس میں ہی برسرِ پیکار ہیں محض اپنے مخصوص نظریات اور صوبائی تعصب کی خاطر اپنے ہی ملک کی جڑوں کو کمزور کررہے ہیں اور دشمن کو موقع فراہم

کر رہے ہیں کہ وہ ان حالات سے فائدہ اٹھائے۔ ماضی میں فائرنگ اور دہشت گردی کی جو فضا پروان چڑھی اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے لیے ملک دشمنوں نے نمایاں کام کیا۔ قمر جمالی پر بھی ملکی حالات بے حد اثر انداز ہوئے جس کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا ہے ۔

دیکھئے حالات یہ اب اور دکھلائیں گے کیا
ریزہ ریزہ ہو کے ہم یوں ہی بکھر جائیں گے کیا

کیوں نہیں کرتے ہیں دونوں مل کے دشمن کی تلاش
بھائی سے یہ بھائی لڑ کر یوں ہی مر جائیں گے کیا

نفرتوں نے انسان کو تنہا کر دیا ہے۔ ایک دوسرے پر بے اعتباری اور بے اعتمادی نے انسان کو انسان سے دور کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ ٹکڑوں اور گروپوں میں بٹ گئے ہیں مختلف نظریات رکھنے والوں سے ملنا جلنا تو در کنار دیکھنے کے بھی روادار نہیں۔ شاعر نے اس کیفیت کو بے حد سلیقے کے ساتھ اپنے انداز میں سمو دیا ہے ۔

بارِ غم کیسے اٹھا پائے گا تنہا آدمی
کیا ہمارے بعد بھی آئے گا ایسا آدمی

گر یہی قحطِ محبت ہے تو اک دن دیکھنا
شہر میں ناپید ہو جائے گا ہم سا آدمی

آج کل جائے اماں کوئی نہیں اس شہر میں
جائے تو جائے کہاں بے سہارا آدمی

تشبیہات و استعارات کا استعمال انہوں نے بے حد قرینے سے کیا ہے ۔

کوئی دنیا میں خریدار نہیں ہے میرا
میرے مالک مجھے یوسف کی جوانی دیدے

❖❖

اے قمر جس نے دل کی تسخیر
کیسا جادو ترے بیان میں تھا

آج کل ہر سو نفسا نفسی کا عالم ہے، عداوتوں کے جال نے دوست احباب کی محبتوں کو جکڑ لیا ہے۔ حسد کی آگ بڑھتی چلی جارہی ہے۔ آج کا انسان آپس میں ہی ایک دوسرے کو ذہنی، جسمانی اذیت اور مالی طور پر دیوالیہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہی ہے کہ انسانی اقدار پر دولت کی ہوس اور ذاتی مفاد نے اپنا قبضہ جمالیا ہے، جسے دیکھو وہ اپنا ہی فائدہ سوچتا ہے، دوسرے کی اسے قطعی فکر نہیں، بس اس کا ہر لحاظ سے بھلا ہونا چاہیے۔ شاعر بھی اس قسم کے واقعات اور حادثات سے دوچار ہے۔

کیا گھر دیا گیا ہے مجھے
در بدر کر دیا گیا ہے مجھے

میں تو پھل دار پیڑ تھا کل تک
بے ثمر کر دیا گیا ہے مجھے

قمر جمالی نے جہاں اپنی غزلیات میں ذاتی و معاشرتی مسائل کا ذکر اور اپنے ماحول کے دکھوں اور تفکرات کی عکاسی کی ہے وہاں انہوں نے فنی باریکیوں کا بھی بے حد خیال رکھا ہے۔ واردات قلبی انہوں نے نہایت خلوص اور دیانت داری کے ساتھ شاعری کے قالب میں ڈھالا ہے۔

☆☆☆

maablib.org

منظوم خراجِ عقیدت

maablib.org

MAAB 1413
maablib.org

ڈاکٹر خیال امروہوی

قمر جمالی کی نذر

وحشت میں کبھی شہر بھی صحرا سا لگے ہے
صحرا بھی مجھے دوزخی صحرا سا لگے ہیں

نازل ہوں خیالات تو ہر لفظ کا رتبہ
سرشاریٔ ادراک میں القا سا لگے ہے

لفظوں نے کیا ذہن کو اس درجہ مکدر
ہر قول میں پُر ہول اندھیرا سا لگے ہے

عیاریٔ اظہار کا پیکر اُسے سمجھیں
وہ شخص جو ظاہر میں مسیحا سا لگے ہے

شیریں ہے کئی شکل میں تنقید کی تاثیر
گو ۱۰ ؎ اس کا ہمیں کڑوا سا لگے ہے

وہ پھول ہو یا خار حرارت ہو کہ شبنم
ہر روپ میں بیدار سراپا سا لگے ہے

جس وسعتِ تخلیق سے فطرت ہے عبارت
انسان تو اس بحر میں تنکا سا لگے ہے

☆☆☆

maablib.org

سہیلؔ غازیپوری

''صحرا میں شجر'' اور قمرؔ جمالی امروہوی

قمرؔ امروہوی ہیں اک جمالی
دیانت دار، سچائی کے ضامن
اخوت اور محبت کی علامت
یہ ہیں ہر لفظ کی حرمت کے داعی
ہیں اک آئینۂ تہذیب مشرق
بہت ہی خوبصورت، نیک سیرت
انہیں ملکی سیاست سے ہے رغبت
سماجی کارکن بھی ہیں
یہ وابستہ ہیں ایسے مدرسے سے
جسے کہتے ہیں اہلِ علم ودانش
دبستاں مصحفی کا
جہاں شعر وادب سے
مقدر کو جگانے کا عمل رہتا ہے پیہم

میسر تھی انہیں ہر دم
شفق، یوسف، تبسم، کی رفاقت
عزیز وارثی کی بھی محبت
کراچی میں ملے ان کو
جنابِ انجم فوقی سے عالم
ہنر کی راہ میں چلنے کے سارے گُر سکھائے

﴿﴾﴿﴾

قمر!
عجب مردِ قلندر ہیں
نظر میں زندگی کے تلخ و شیریں
سبھی لمحے سمیٹے
حروفِ معتبر سے ان گنت شمعیں جلا کر
غزل کے دشت کی تاریک راہوں کو
منور کر رہے ہیں
شعور و آگہی کے قمقموں کو
روایت کی ہوائے خاص دے کر
سلیقے سے جلاتے جا رہے ہیں
دھنک صورت غزل جیسے
دمکتی جا رہی ہے
چمکتی جا رہی ہے

﴿﴾﴿﴾

یہ صحرا میں شجر کس کے لئے ہے
مسافر بھی نہیں کوئی ادھر آتا
عجب ہے دھوپ کی شدت

زمیں پر تشنگی پھیلی ہوئی ہے
بس اک احساس ہے
ٹھنڈی رُتوں کا
کہ سایہ بخش دے گا وہ شجر
جس کو محبت سے لگایا ہے قمرؔ نے
جنہیں امید ہے
مسافر آئے گا کوئی

◆◆◆

چلیں صحرا کی تھوڑی خاک چھانیں
ذرا دیکھیں
کہ ہم جیسا کہاں ہے چاہنے والا کسی کو
کہاں دیوار سائے سے ہے لپٹی
کوئی کرتا ہے کیسے گردشِ ایام کو زنجیر دیکھیں
کوئی دل میں لگا کر آگ کیسے
کسی کو آزمانا چاہتا ہے
نشیمن کے قریں بیٹھا ہے کیوں کوئی
جسے برق و شرر کے حوصلے کو دیکھنا ہے
سخن ور کون ہے ایسا
کہ جس پر سنگ باری ہو تو وہ
اپنے سخن کے پھول برسائے
کہاں کوئی خدا سے
خطابت کے لئے شعلہ بیانی مانگتا ہے
نہ جانے کیوں
مکاں کا پیڑ کس نے کاٹ ڈالا

یہ کیوں بے اعتباری کا ہے منظر
ہمیں کیوں بے ہنر رکھا گیا ہے
کسے معلوم ہے
سمندر کا ہے کتنا ظرف آخر
کسے معلوم ہے
مکاں تعمیر کرنے میں لہو کتنا بہا ۔ بہر نوع
یہ صحرا میں شجر پھولے پھلے گا
لگایا ہے قمر امروہوی نے
جنہیں امید ہے
مسافر آئے گا کوئی نہ کوئی

☆☆

صابر براری

''معنی خیز تاریخ''

۱۹۹۸ء

''خوش بہار صحرا میں شجر''

۱۴۱۹ھ

''تصنیف شاعرِ پاکیزہ زبان قمر جمالی امروہوی''

۱۹۹۸ء

معترف ہیں اہلِ دانش بالیقیں
ارفع و اعلیٰ ہے تخلیقِ قمر

کہہ دے صابر اس کی تاریخ طبع
''گلشنِ مبسوط صحرا میں شجر''

۱۴۱۹ھ

☆☆☆

امیر السلام ہاشمی

بے مثال احمد خاں

مثال[۱] احمد کی یارو بے مثالی دیکھتے جاؤ
قمر[۲] روشن ہے جس سے وہ جمالی[۳] دیکھتے جاؤ
جمال[۴] احمد کا جو فرزند ہے شوہر حسینہ کا
امینِ حسن کی شیریں مقالی دیکھتے جاؤ
تم اپنے دور میں موجود حالی دیکھتے جاؤ
وہ شاعر فخرِ امروہہ جسے کہئے تو اچھا ہے
وہ شاعر جس کا فنی قد، قدِ بالا سے اونچا ہے
وہ شاعر جس نے صحرا میں شجر فن کے لگائے ہیں
وہ شاعر جس کا شہرِ فن میں ہر سو بول بالا ہے
اُسی شاعر کی شا مثا! یکھتے ؤ

وہ شاعر جس کا ہر مصرعہ نیا پیغام دیتا ہے
نئے معنی جو لفظوں کو نرالے نام دیتا ہے
ادب سے دست بستہ سامنے الفاظ رہتے ہیں
وہ ان الفاظ کو چن کر اِنہیں انعام دیتا ہے
اِنہیں لفظوں کی تصویریں نرالی دیکھتے جاؤ
رہے گا نام اردو شاعری میں اُس کا تابندہ
کیا ہے اس نے دورِ مصحفی جو آج پھر زندہ
دعا یہ ہے کہ اُس کا فن یونہی بڑھتا رہے آگے
رہے قائم یہ فنی سلسلہ زندہ و تابندہ
دعائے ہاشمی ہوگی نہ خالی دیکھتے جاؤ
بڑھے گی اور دانِ بے مثالی دیکھتے جاؤ

☆

۱.....مثال احمد خاں جمالی
۲.....قمر جمالی.....تخلص
۳.....جمال احمد خاں (والد قمر جمالی صاحب)
۴.....بیگم حسینہ (زوجہ قمر جمالی)

☆☆

اظہر ضیائی

نذرِ قمر جمالی

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل
می گویمت دعا و ثنا می فرستمت

در راہِ عشق مرحلۂ قرب و بعد نیست
می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

☆☆☆

maablib.org

نسیم احمد نسیم

قطعات

قمر جمالی امروہوی کی نذر

عندلیبانِ چمن کو نغمگی حاصل ہوئی
شب گزیدانِ جہاں کو روشنی حاصل ہوئی

ہاں قمر امروہوی کا یہ اک اعزاز ہے
رندِ مے کش کو ادائے سرمدی حاصل ہوئی

❖❖

فکر کو بالیدگی الفاظ کو ندرت ملی
خامہ کو تقدیس ، فنِ شعر کو عظمت ملی

حق تو یہ ہے کہ قمر امروہوی کے فیض سے
ناقدانِ عصرِ حاضر کو بڑی عزت ملی

❖❖

ڈاکٹر یوسف جاوید

''صحرا میں شجر'' کو دیکھ کر

تیرہ و تاریکی شب میں قمر کی صورت
اب کہاں لوگ ہیں صحرا میں شجر کی صورت

جو کہ ہو جہدِ مسلسل میں سفر کی صورت
اس کو گھر میں بھی کہاں ملتی ہے گھر کی صورت

دی کتاب اُس نے جو ہاتھوں میں ثمر کی صورت
جس کا ہر شعر دمکتا ہے قمر کی صورت

چاندنی جیسی وہ گفتار کی نرمی اُس کی
ہائے وہ شخص کہ ملتا ہے قمر کی صورت

بے اماں کے لئے اک ڈھال بنا پھرتا ہے
اُس کو ہر وار نے جانا ہے سپر کی صورت

سائباں بن کے ملا ہے وہ تپیدوں کے لئے
بے دروں سے جو ملا ہے تو وہ در کی صورت

وادیٔ علم و ہنر میں وہ رہا مثلِ قمر
کوچہ کوچہ میں بسا اہلِ نظر کی صورت

شاعری میں کہ جو وا کرتا ہے اسرار و رموز
وہ سیاست میں بھی ملتا ہے خضر کی صورت

وہ قمر جس کا ملا ہے ہمیں ہر سمت جمال
جس کو ہر شام میں پایا ہے سحر کی صورت

شرف النفس ہے وہ اور شریف الطبع
فخرِ انساں ہے وہ خالق کے بشر کی صورت

اُس کو جانا ہے تو یوں جانا ہے یوسف جاوید
اہلِ دل اہلِ جگر اہلِ نظر کی صورت

☆☆

maablib.org

ہاں وہی پہچان ہے جس شخص کی شائستگی
ہاں وہی جو تیرگی میں بن گیا خود روشنی
ہاں نسیم اس شخصیت کے نام لکھ دیجئے یہ شام
ہاں وہی مخلص بشر جو ہے قمر امروہوی

☆☆

maablib.org

سچی شاعری صحت مند معاشرے کی تشکیل کر سکتی ہے

عارف شفیق سے قمر جمالی کی گفتگو

قمر جمالی امروہوی ایک عرصہ سے شعر کہہ رہے ہیں مشاعروں میں ان کے اشعار سن کر احساس ہوا کہ اتنے اچھے شعر کہنے والا شاعر اس انداز سے منظرِ عام پر کیوں نہیں آسکا جو اس کا جائز حق ہے ایک ایسی فضا میں جہاں کسی بھی جینوئن شاعر کا ادبی منظر نامے میں رہنا ناممکن نہ سہی مشکل ضرور ہو گیا ہے قمر جمالی یقیناً ظفر اقبال، منیر نیازی، جون ایلیا، انور شعور، صابر ظفر، یا ثروت حسین کے قبیلے کے شاعر نہیں ہیں لیکن اپنے ہمعصر شعرا میں یقیناً اتنی اہمیت ضرور رکھتے ہیں کہ ان کے فن کو سراہا جائے روایتی شاعری کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی زندگی کے تجربوں کو تغزل میں ڈھالنے کا ہنر انہیں آتا ہے اکتوبر ۱۹۹۸ء میں ان کا شعری مجموعہ ''صحرا میں شجر'' شائع ہوا تو ادب کے سنجیدہ قارئین کو ان کی شاعری سمجھنے کا موقع ملا بہار شاہجہانپوری، سحر انصاری، حسنین کاظمی، ساقی امروہوی، ہوش امروہوی، قیصر امروہوی، اور نور احمد میرٹھی نے ان کے

فن اور شخصیت کے حوالے سے مضامین اور آراء تحریر کیں جو قمر جمالی کی شاعری کو سمجھنے میں بڑی معاون ثابت ہوئیں مجھے قمر جمالی امروہوی اپنے معاشرے سے جڑے ہوئے انسان نظر آئے ان کا سماجی اور سیاسی شعور ان کی شخصیت کا سب زیادہ پر اثر رخ ہے وہ اپنے عہد کے اہم مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

⟫......آپ نے شاعری کی ابتدا کب کی اس کے محرکات کیا تھے اور اس وقت کی ادبی فضا کیا تھی؟

⟬⟫......بچپن ہی میں ترنم کا دلدادہ تھا سن شعور میں پہنچ کر مترنم شعرا میری پسندیدگی کا مرکز ٹھہرے ان شعرا کی تقلید میں خود بھی مصرعوں کے جوڑ توڑ میں مصروف ہو گیا اگر کسی مترنم شاعر کی غزل پسند آتی تو خود بھی اسی غزل پر غزل کہنے کی کوشش کرتا چونکہ جیسے جیسے شعر کہتا تھا بعینیہ ویسے کسی مشاعرے میں نہیں پڑھ سکتا تھا لہذا ضرورت محسوس ہوئی کہ کسی صاحب فن سے مشورہ کرنا چاہیے، چنانچہ نگاہِ انتخاب حضرت شعب احمد عباسی حزیں پر ٹھہری میں ان سے مکمل طور پر استفادہ نہ کرسکا ان سے بہت کم نیاز حاصل رہا ان کی عدم موجودگی میں اپنے دیرینہ رفیق اور مستند شاعر یوسف بچھا ڑیونی سے مشورہ کیا تقسیم ہند کے بعد لاہور وارد ہو کر صوفی غلام مصطفی تبسم سے وابستہ ہوا لیکن یہ عرصہ بھی بہت مختصر رہا مگر اس قلیل عرصے میں میری شاعری صیقل ہو گئی کراچی آکر انجم فوقی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا کچھ عرصہ بعد موصوف نے مجھے فارغ الاصلاح کی سند عطا کر دی جس کا تذکرہ انہوں نے اپنی کتاب میں تحریر فرمایا ہے۔ رہا اس دور کی ادبی فضا کا سوال تو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ موجودہ دور ماضی کے دور کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکا ماضی میں مشاعروں میں سامعین کی تعداد زیادہ اور شعرا کی تعداد کم ہوتی تھی سامع بھی ایسے کہ جنہیں معیاری شعر کی پرکھ تھی نشست و برخاست خاص طور پر مدنظر ہوتی تھی۔

⟫......طرحی مشاعروں کی کیا افادیت تھی ان کے ختم ہونے سے شعر و ادب پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

⟬⟫......طرحی مشاعروں کو میں ادبی دنگل قرار دیتا ہوں ہر شاعر اپنی صلاحیت کا

بھر پور استعمال کرتا ہے اور دوسروں پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے دوسری جانب کلام میں اضافہ ہوتا ہے طرحی مشاعروں کا سلسلہ منقطع تو نہیں ہوا لیکن بہت کمی واقع ہوگئی وہ بھی اس لئے کہ مشاہیر میں سے کوئی طرحی مشاعروں میں شرکت کرنا گوارا نہیں کرتا ضرورت اس بات کی ہے کہ طرحی مشاعرے جاری رہیں تاکہ نوآموز بھی مشقِ سخن جاری رکھ سکیں۔

آج کے اور ماضی کے مشاعروں میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

...... موجودہ دور میں صرف شعرا کو مدعو کیا جاتا ہے اور سامعین کو نظر انداز کر دیتے ہیں چونکہ یہ روایت قائم ہوگئی ہے کہ مشاعروں میں کام و دہن کی لذت کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے اور منتظم اس بار گراں کو نہیں اُٹھا سکتے لہٰذا سامعین مدعو ہی نہیں کئے جاتے ماضی میں مشاعروں میں صرف چائے سے تواضع ہوتی تھی لیکن کامیاب ہوتے تھے۔

...... آج کے دور میں استاد شاگرد کا رشتہ بھی ختم ہو گیا ہے اس کی کیا وجوہات ہیں؟ اس رشتے کے ختم ہونے سے آئندہ نسلوں کو کن مشکلات کا سامنا ہے؟

...... استاد شاگرد کا رشتہ اب بھی قائم ہے فرق یہ ہے کہ پہلے الاعلان تھا اب در پردہ ہے چونکہ ہر شاعر بزعم خود استاد ہے اس لئے شاگردی کی تذلیل کیسے گوارا ہو آنے والی نسل پر اس کے بدترین اثرات ہوں گے کوئی بھی اپنی تربیت کے لئے کسی کو اپنا استاد تسلیم نہیں کرے گا نتیجتاً علم و ادب کا انحطاط لازمی ہے۔

...... آج کل پھر غزل تنقید کا نشانہ بن رہی ہے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ غزل کے مقابلے میں نظم جدید عہد کے تقاضوں سے زیادہ ہم آہنگ ہے؟

...... میرے خیال میں شاعر وقت کا نقیب ہوتا ہے عصری تقاضے مشاہدات تجربات آج کی غزل کا جزو لازم ہیں نظم بے شک ان تقاضوں سے ہم آہنگ ہے لیکن جب تک از بر نہ ہو مرکزی خیال ذہن میں نہیں رہتا اس کے برعکس غزل کا ہر شعر اپنی پسند اور مزاج کے اعتبار سے ذہنوں میں محفوظ رہتا ہے اور سفر میں بھی رہتا ہے۔

...... آپ کی نظر میں سچی اور معیاری شاعری کی کیا تعریف ہے اور آپ کے ہمعصر کون سے شعرا سچی اور معیاری شاعری کر رہے ہیں؟

◆.......معیاری اور سچی شاعری کی بنیاد مشاہدات اور تجربات پر ہے اور یہی شاعری زندہ رہنے والی شاعری ہے۔بہت سے شعرا سچی اور معیاری شاعری کر رہے ہیں ان میں کچھ نامعلوم وجوہ کی بناء پر گمنام ہیں جس کی وجہ صرف عوامی رابطوں کا فقدان ہے میرے ہمعصر شعرا میں کچھ مستند اور کہنہ مشق شاعر ہیں مثلاً سرشار صدیقی، جون ایلیا، ساقی امروہوی، قمیم ردولوی، روشن علی عشرت، شبنم رومانی، محسن بھوپالی اور تابش دہلوی اور بھی کئی م ہیں لیکن طوالت مدِ نظر ہے۔

◆.......کسی بھی تخلیق کے لئے مشاہدے اور مطالعہ کی کیا اہمیت ہے؟

◆.......میں عرض کر چکا ہوں کہ معیار کی بنیاد مشاہدے پر ہے اور بغیر مطالعہ کے کوئی تخلیق کار کامیاب نہیں ہوسکتا اور نہ شاعری میں پختگی آسکتی ہے۔

◆.......آزاد نظم اور نثری نظم کے تجربے ہمارے ہاں کس حد تک کامیاب ہیں؟

◆.......جہاں تک آزاد اور نثری نظم کی کامیابی کا تعلق ہے تو میری نظر میں غزل کے مقابلے میں صفر ہے یہ ضرور ہے کہ کچھ کہنہ مشق شعرا نے طبع آزمائی کی ہے اور کامیاب بھی رہے ان کی کامیابی بھی وہیں تک محدود رہی ماضی کے شعرا نے بھی ان اصناف میں بہت کچھ تحریر کیا ہے اور کامیاب بھی رہے لیکن اس دور میں اتنی پذیرائی نہیں ہوئی۔

◆.......ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل میں شاعری کیا کردار ادا کرسکتی ہے؟

◆.......شاعری ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل میں مؤثر کردار ادا کرسکتی ہے لیکن بات وہی سچی اور معیاری شاعری کی ہے۔

◆.......ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری پر کیا اثرات مرتب کئے؟

◆.......ترقی پسند تحریک نے غزل کی روح پر شب خون مارا ہے نئے نئے الفاظ کے مفاہیم کو بدل دیا یہاں تک کہ ابہام کی حدیں بھی پار ہوگئیں بعض مواقع پر سامع مفہوم کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

☆☆

روزنامہ ایکسپریس کے آصف مالک سے
قمر جمالی امروہوی کی گفتگو

جب کسی امتحان سے گزرے
ہم بڑی آن بان سے گزرے

سہلِ ممتنع میں یہ خوبصورت شعر قمر جمالی امروہوی کا ہے اور بقول پروفیسر حسنین کاظمی ان کی شخصیت اور فکروفن کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ قمر جمالی نرے شاعر نہیں ، ہیں بلکہ انہوں نے اپنی جدوجہد سے بھرپور زندگی اس طرح بسر کی کہ ایک شاعر یعنی فنکار معاشرے کے عام افراد سے زیادہ ذمہ دار اور باشعور نظر آئے۔ وہ کاروبار کرتے ہیں، ان کے بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں ادب پرور ہیں، مشاعروں کے منتظم ہیں اور خود غزل کے بہت ستھرے شاعر ہیں۔ انہوں نے غزل کی کلاسیکی روایات کا بھرپور خیال رکھتے ہوئے جدید زندگی کے مسائل و تجربات کو بیان کیا ہے۔ پہلا شعری مجموعہ "آفریدن" ۱۹۵۴ء میں اور دوسرا "صحرا میں شجر" ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا، تیسرا مجموعہ "زخم آشنائی" زیر طبع ہے۔ چند اشعار میں رنگِ سخن ملاحظہ فرمائیے۔

سوچتا ہوں یہ سر دار نہ لے جائے مجھے
ایک جرأت جو مری فطرت بیباک میں ہے

کب تلک کرتے رہو گے تم سحر کا انتظار
تیرہ بختو یہ اندھیرے نور برسائیں گے کیا

دل ہی آمادہ نہ تھا سر کو جھکانے کے لیے
ورنہ رستے میں بہت تھے ترے در سے پہلے

قمر جمالی امروہوی روہیل کھنڈ کے یوسف زئی پٹھان ہیں۔ انگریزوں کے دور میں ان کے اجداد ہجرت کر کے امروہہ میں آباد ہو گئے وہیں یہ ۳؍ جنوری ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے خاندان قدامت پسند تھا اور انگریزی تعلیم کو حرام سمجھتا تھا، سو انہیں ابتدا میں دینی تعلیم اور فارسی کی تعلیم ملی، ننھیال ذرا ماڈریٹ تھا تو والدہ کی خواہش پر دہلی چلے گئے، تیسری جماعت کے طالب علم تھے مگر داخلے کے لیے اسکول میں ٹیسٹ دیا تو انہیں ساتویں جماعت میں داخلہ دے دیا گیا اور امتیازی نمبروں سے میٹرک کیا۔ فرماتے ہیں "اس زمانے کے سب شرفاء کا حال بُرا تھا تو میٹرک کے بعد میں بھی تلاشِ روزگار میں نکل گیا، کئی ملازمتیں کیں، سیاست میں حصہ لیتا تھا" قمر جمالی امروہوی کانگریسی اور مولانا آزاد کے جانثاروں میں تھے۔

شعر گوئی کی ابتدا کے حوالے سے قمر جمالی امروہوی نے بتایا "گنگنانے کا سلسلہ تو بہت ابتدائی عمر سے ہی شروع ہو گیا تھا، مجھے گویوں کے بجائے شعراء کا ترنم اچھا لگتا تھا اور میں شعر گنگناتا رہتا تھا، اکثر یوں بھی ہوا کہ راہ چلتے کسی کو روک کر ایک شعر سنایا کہ یہ فلاں مشہور شاعر کا ہے، یا پھر کسی مشہور شاعر کے کسی شعر کو اپنا کہہ کر سنا دیا۔

ہمارے محلے میں ایک سحری جگانے والا نعتیں پڑھتا تھا تو ہم نے بھی اس کی نقل میں نعت کے کچھ اشعار لکھے اور وقتِ سحر گلیوں میں گانے لگے لیکن شاعری کی باقاعدہ ابتدا ایک طرحی مشاعرے سے کی جس کی صدارت جگر مرادآبادی کر رہے تھے، جگر صاحب نے

حوصلہ بڑھایا کہ جو شخص بڑے مضمون کو دو مصرعوں میں فنی نزاکتوں کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو وہ شاعر ہے"

قمر جمالی امروہوی سے ہونے والی مزید گفتگو سوال و جواب کی صورت میں ملاحظہ ہو:

...کسی کے باقاعدہ شاگرد ہوئے؟

......جی ہاں! ......اگر آپ موزوں طبع ہوں تب بھی کسی کی شاگردی ضروری ہے کیونکہ استاد ہی زبان کا استعمال اور الفاظ کا دروبست سکھاتا ہے، دوسری مدد اساتذہ کے مطالعے سے ملتی ہے۔ ابتدا میں، میں نے یوسف صدیقی سے اصلاح لی، عزیز وارثی سے بھی مشورۂ سخن کرتا رہا۔ میں ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ہجرت کر کے لاہور آ گیا اور شکیل صاحب کے ہاں قیام کیا جو ریڈیو پر خبریں پڑھتے تھے۔

ایک دن میں ایک دکان کے سامنے سے گزرا جو ایک پینٹر کی دکان تھی، یہ احمد صاحب تھے، افریقہ سے آئے تھے، میں نے ان سے کہا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں، ڈرائنگ میری شروع سے اچھی تھی تو میں ان کے ساتھ کام کرنے لگا۔ وہیں ایک نوجوان ڈاکٹر آتے تھے جو صوفی تبسم کے بھتیجے تھے، انہوں نے کہیں اپنے چچا سے ذکر کیا کہ ایک نوجوان احمد صاحب کے پاس آیا ہے بڑی شستہ اور ادق زبان بولتا ہے، صوفی صاحب کو تجسس ہوا انہوں نے مجھے بلوایا، کہنے لگے صاحبزادے! کہاں سے آئے ہو؟ میں نے کہا "امروہے سے" پھر کہا لگتا ہے، شعر کہتے ہو، میں نے کہا، جی بیماری تو ہے، اچھا صوفی صاحب مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے بڑی احتیاط سے کام لے رہے تھے ورنہ ظاہر ہے ان کی زبان سے پنجابی کے الفاظ پھسلتے تھے، خیر صوفی صاحب نے کہا "نعت کہہ لو گے" میں نے کہا۔ کبھی کہی تو نہیں، مگر صوفی صاحب نے ایک طرح دے دی اور کہا نعت لکھ لاؤ، میرے تو پسینے چھوٹ گئے مگر پھر مطلع ہو ہی گیا۔

یقیناً قابلِ توقیر ہے ہر دل کی گہرائی
مگر وہ دل کہ جس میں عشقِ احمدؐ نے جگہ پائی

صوفی صاحب نے سنا تو پھڑک گئے، انہوں نے شعر فہمی میں میری مدد کی، وہ

کہتے تھے کہ اس لفظ کے بغیر بھی مفہوم ادا ہو جاتا ہے، شعر میں گہرائی لانے کے لیے کوئی دوسرا لفظ یہاں لاؤ، انہوں نے ہی مجھے سکھایا کہ قافیہ پیمائی سے آپ کبھی شاعر نہیں بن سکتے، قافیے سامنے رکھ کر شعر کہنے کے بجائے اپنے مفہوم کے مطابق قافیے تلاش کرنا چاہیں۔ مجھے گل وبلبل کے افسانے اپنے شعر میں سنانا پسند نہیں تھا، میرے آئیڈیل جوشؔ اور احسان دانشؔ تھے۔

......آپ کا پہلا مجموعہ ۵۴ء میں اور دوسرا ۹۸۱ء میں شائع ہوا یہ فاصلہ اتنا زیادہ کیسے ہو گیا؟

......اصل میں، میں نے شاعروں کا انجام دیکھ لیا تھا، اس لئے میں نے اپنے معاش پر بھرپور توجہ دی، اپنے سارے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی، ہمارے خاندان میں انگریز کی نوکری کو حرام سمجھا جاتا تھا، میرے بچے بھی ملازمت نہیں کرتے، سب کا اپنا کاروبار ہے، اب سب بچوں کی ذمہ شرکت کرنا میرے لئے ضروری نہیں ہے۔ ویسے میں آپ کو بتاؤں کہ کراچی میں مشاعرے اور اس کے بعد کھانے کی روایت میں نے ہی ڈالی ہے، میرے مشاعروں میں بیس شعرا ہوتے تھے پچاس سننے والے بھی ہوتے تھے اور ہمارے دور کے شعراء کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ ہر مشاعرے میں نئی غزل پڑھتے ہیں اور جب تک فرمائش نہ ہو پرانی غزل نہیں سناتے۔

......گویا آپ نے شاعر کو ایک پریکٹیکل مین کے طور پر پیش کیا ہے لیکن شعراء کے بارے میں عمومی تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ شعراء خود کو ہر طرح کی سماجی ذمہ داریوں سے مبرا سمجھتے ہیں اور دنیا سے بے خبر ہوتے ہیں، جیسے ہمارے سامنے مجازؔ اور جونؔ ایلیا کی مثالیں ہیں؟

......آپ نے جونؔ اور مجازؔ کی مثالیں دیں لیکن شعراء کی نمائندگی حمایت علی شاعرؔ، محسنؔ بھوپالی، راغبؔ مرادآبادی اور حفیظؔ جالندھری بھی کرتے ہیں اور کتنے نام گنواؤں یہ سب پریکٹیکل مین ہیں۔

......جمالی صاحب شاعری آپ کے نزدیک کیا ہے؟

......شاعری دریا کو کوزے میں بند کرنے کا نام ہے، کم از کم غزل میں تو یہی ہے۔ آپ جو دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، اسے کم سے کم الفاظ میں احسن طور پر موزوں کرنے کا نام شاعری ہے۔ اب جیسے کسی نے پوچھا کہ آپ امروہہ سے کیوں چلے

آئے تو ذہن میں ماضی کی یادوں کا جگ بسیرا ہو گیا اور بہت سے تجربات یاد آئے اور پھر کہا

اس سے بہتر تھا اندھیرے میں بسر کر لیتے
رات کے بعد جو انجامِ سحر دیکھا ہے

شاعری وہی ہے جو زندگی سے مربوط ہے۔ شعر ایسا ہو کہ پچاس سال بعد کوئی پڑھے تو اسے پتہ چلے کہ پچاس سال پہلے کے کیا حالات تھے۔

یہ تو آپ حالات حاضرہ کی بات کر رہے ہیں، اگر یہی شاعری ہے تو پھر شعر کی آفاقی قدر رہی کہاں گئی؟ اگر آپ رئیس امروہوی کے پچاس سال پرانے قطعات پڑھیں تو وہ آج بھی آپ کو Relevant محسوس ہوں گے۔ یہی آفاقیت ہے۔ میرے کچھ شعر سنئے۔

حسن موجود تھا تخلیقِ بشر سے پہلے
آئینہ کوئی نہ تھا آئینہ گر سے پہلے

تو نے ڈھالا تھا جسے دستِ ہنر سے پہلے
بے گھری اس کا مقدر ہوئی گھر سے پہلے

اپنی پلکوں پہ دیے کس نے کیے ہیں روشن
اس اندھیرے میں مرے دیدۂ تر سے پہلے

کیا یہ آفاقی شاعری نہیں ہے؟

...... یہ بتائیے کہ روایت شعر میں کب توانا حوالہ بنتی ہے اور کب یہ فرسودگی کی علامت ٹھہرتی ہے؟

...... دیکھئے آج کل لوگ بے سوچے سمجھے ہر کسی کے بارے میں کہہ دیتے ہیں کہ فلاں روایتی شاعر ہے۔ قافیے اور ردیف کا التزام روایت ہے، اساتذہ نے جن بحور میں شعر کہے ہیں ان ہی بحور میں شعر کہنا روایت ہے لیکن جہاں یہ التزام نہ برتا جائے وہاں روایت سے انحراف ہے۔ یہ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث ہے جو بہت پرانی ہو چکی ہے۔

...... کیا آپ اپنا شمار ترقی پسندوں میں کریں گے؟

◆◆ ...... جی بالکل! فیض کی نظم "یہ داغ داغ اجالا ، یہ شب گزیدہ سحر" سب سے پہلے میں نے ہی اپنے پرچے میں چھاپی تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی نشستوں میں شریک ہوتا تھا۔

◆ ...... آپ غزل کے شاعر ہیں لیکن کہا جارہا ہے کہ نئی صدی جدید نظم کی صدی ہوگی کیونکہ ۹/۱۱ کے بعد کی دنیا انسانی کلوننگ کے عہد کے احساسات غزل میں بیان نہیں ہو سکتے ؟

◆◆ ...... یہ خیال بالکل غلط ہے، غزل اتنی توانا صنفِ سخن ہے کہ اس میں ہر عہد اور ہر طرح کے احساسات بڑی خوبصورتی سے بیان کئے جاسکتے ہیں۔

◆ ...... آپ کے پسندیدہ شاعر جوشؔ ہیں وہ تو نظم کے شاعر ہیں؟

◆◆ ...... جوشؔ غزل کے بھی اچھے شاعر ہیں۔

◆ ...... لیکن نقادوں نے کہا ہے کہ جوشؔ الفاظ کا زیاں بہت کرتے ہیں، ان کا کلام غث نظر آتا ہے؟

◆◆ ...... یہ خیال بھی غلط ہے، تقسیم ہند کے اعلان کے بعد ریڈیو پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن، پنڈت نہرو اور قائداعظم کی تقریر کے بعد چوتھا پروگرام جوشؔ کی نظم کا تھا، ان کی نظم تھی کہ "خزاں کہیں گے پھر کسے یہی اگر بہار ہے" آپ وہ نظم پڑھ لیجئے بتائیے الفاظ کا زیاں کہاں ہے! ایک ایک لفظ اپنی جگہ اٹل ہے۔

◆ ...... آپ نظم کے اتنے مخالف کیوں ہیں؟

◆◆ ...... نظم کی خامی یہ ہے کہ جب تک آپ پوری نظم نہ پڑھ لیں یا پوری نظم نہ سن لیں تو اختتام سے پہلے آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے جبکہ غزل کا ہر شعر بلکہ ہر مصرعہ اپنی جگہ ایک مکمل مضمون پیش کرسکتا ہے اور بعض مصرعوں کے تو ٹکڑے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرگئے ہیں۔

◆ ...... آزاد نظم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

◆◆ ...... آزاد نظم شاعری نہیں ہے۔

◆ ...... اگر آپ آزاد نظم کو رد کررہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ ن۔ م۔ راشد کو بھی نظر انداز کررہے ہیں؟

◈◈ ...... ن۔م۔راشد نے جو خیالات پیش کئے ہیں، ہم ان کی قدر کرتے ہیں لیکن زبردستی ہم اسے شاعری تسلیم نہیں کر سکتے بہتر تھا کہ وہ نثر میں اپنے خیالات بیان کرتے۔

◈ آزاد نظم میں بحر تو ہوتی ہے صرف ردیف قافیہ نہیں ہوتے؟

◈◈ نہیں آزاد نظم کو میں نثر ہی سمجھتا ہوں۔

◈ نثری نظم کو تو آپ قابل گردن زدنی سمجھتے ہوں گے؟

◈◈ ...... جواب میں طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ خاموشی۔

◈ جمالی صاحب اگر آپ فن کو اس کے مروجہ پیمانوں میں قید کر کے دیکھیں گے تو پھر ادب میں تجربہ کہاں سے آئے گا؟

◈◈ ۔ تجربہ اصولوں کو نظر انداز کر کے نہیں کیا جا سکتا۔ کسی چیز کو توڑنے کا نام تجربہ نہیں ہے، یہ تعمیر نہیں تخریب ہے۔

◈ ...... اچھا یہ بتائیے کہ آج شاعری اتنی روبہ زوال کیوں ہے؟

◈◈ ...... دیکھیے نوابوں اور مہاراجوں کے دور میں شعراء کی دربار سے سرپرستی ہوا کرتی تھی۔ آج کے دور میں اگر کوئی دو وقت کی روٹی کے لیے رات دن بھاگ دوڑ میں لگا ہوا ہے، طرح طرح کے مسائل سے نبرد آزما ہے اور پھر بھی اس میں شعر کہنے کا حوصلہ ہے تو یہ بڑی بات ہے۔

◈ ...... آپ شہر قائد کے بنیادی منتظمین میں شامل ہیں، یہ بتائیے کہ اس عالمی مشاعرے کا معیار دن بدن گرتا کیوں جا رہا ہے؟

◈◈ ...... یہ بات درست ہے کہ اب معیار پہلے جیسا نہیں رہا۔

◈ ...... مشتاق احمد یوسفی صاحب نے عالمی مشاعرے کی طرف ہی اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ جو شعر بیک وقت دس ہزار کے مجمعے کی سمجھ میں آجائے وہ سب کچھ ہو سکتا ہے شعر نہیں ہو سکتا، آپ کا کیا تبصرہ ہے؟

◈◈ ...... یوسفی صاحب کی بات سولہ آنے درست ہے۔ چھ سال پہلے ایم کیو ایم کا ایک عالمی مشاعرہ ہو رہا تھا، میں یہاں یہ واضح کر دوں کہ شہر قائد کے عالمی

مشاعرے میں میں کبھی نہیں پڑھتا، کیونکہ دوسرے امیدوار بہت زیادہ ہوتے ہیں، تو اس مشاعرے میں فجر کی اذان کے وقت منظر بھوپالی کے بعد میری باری آئی، منظر نے اپنے ترنم سے مشاعرہ لوٹ لیا تھا لیکن جب ہم نے شعر سنائے مجمع پر سناٹا طاری تھا۔ دراصل مشاعروں کے شاعر اور ہوتے ہیں، کتابوں کے اور۔ جب ہم مشاعروں کے شاعر تھے اس وقت تک شاعر نہیں تھے۔

☆☆☆

MAAB 1431
maablib.org

شائستہ سیاست و ادبی شخصیت۔ قمر جمالی

قمر جمالی کی شاعری میں شگفتگی و شائستگی بھی ہے، برجستگی و بے ساختگی بھی...... پھر عجیب کمال یہ کہ قمر کا فکری تنوع، گیرائی سے گہرائی کی طرف آرہا ہے۔ گہرائی سے گیرائی کی طرف نہیں۔ یہ معمولی بات نہیں، بڑی بات ہے۔ ادبی اصطلاح میں سادگی و پُرکاری اسی کو کہتے ہیں۔

انجم فوقی بدایونی

قمر جمالی کی زبان سادہ و سلیس ہے۔ الفاظ کا استعمال بہت خوبصورت ہے۔ جس سے نغمگی پیدا ہوتی ہے۔ بیان میں برجستگی اور بے ساختگی ہے۔ کہیں کہیں شعر میں مکالماتی انداز اختیار کیا ہے۔ قمر جمالی کی غزلوں کے اکثر اشعار ضرب المثل کے زمرے میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ حامد

قمر جمالی امروہوی کا لکھا پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تخلیق شعر سے ان کا تعلق اور وابستگی جمالیاتی اور فنی دائرہ تک محدود نہیں ہے۔ ان کی نظر میں شعر و ادب کسی قوم کی تہذیبی علامت بھی ہے۔

پروفیسر سحر انصاری

قمر جمالی کی اکثر غزلیات سادگیٔ بیان، سلاست و نغمگی میں لاجواب ہیں۔ ان میں دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ علاقائی و استعاراتی و کنائی طرز بیان کے باوجود انداز سلجھا ہوا ہے، گنجلک پن موجود نہیں۔ ان میں ایمائیت و رمزیت میں مفہوم کا چہرہ واضح مگر بہت پُر معنی ہے۔

محسن اعظم ملیح آبادی

قمر جمالی کے یہاں خارجیت و داخلیت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے اور غزل کے حوالے سے ایک ایک نہایت نیک عمل ہے۔ ہرچند اپنے کلام میں جگہ جگہ سماجی قدروں، معاشرتی رویوں، سیاسی اکھاڑ پچھاڑ، معاشی زبوں حالی، انسانی توہین اور اخلاقی زوال کی تصویر کشی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تاہم انھوں نے تغزل کو کہیں مجروح نہیں ہونے دیا۔

قیصر نجفی